تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں

شائع کردہ:

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

۶۸۶

فہرست مضامین

بابری مسجد

انتساب

جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور وطن دوستی

کے

نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

فیض آباد مسلمانوں کا شہر سمجھا جاتا تھا، کیونکہ یہ نوابانِ اودھ کا دار السلطنت کچھ دنوں تک رہا، اسی کا ایک حصہ اجودھیا ہے، اس سے بھی مسلمانوں کا عقیدت مندانہ لگاؤ رہا، کیونکہ ان کی روایت کے مطابق یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے لڑکے حضرت شیث علیہ السلام کی قبر ہے، جس کے بڑے احاطہ میں بہت سے بزرگانِ دین بھی مدفون ہیں، اس کی بھی شہرت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام حضرت ہند بن نوح اور حضرت ایوب کی بھی قبریں ہیں، واللہ اعلم بالصواب، یہاں نخشی بابا، حضرت لعل شاہ باز قلندرؒ، جنگی شہیدؒ، الٰہی بخش مجذوبؒ، علم بخشؒ، شاہ مدارؒ، سید جلال الدین خراسانیؒ شاہ شمن فریادرسؒ، حضرت جمال الدینؒ، شاہ ابراہیمؒ، شاہ چپؒ، قاضی قدوہؒ، حضرت سلطان موسیٰ عاشقانؒ، حضرت شاہ علی اکبر میر کشادیؒ، بہادر شاہؒ، کرم شاہؒ، قطب شاہؒ، شاہ بدیع الدینؒ، حضرت جلال الدینؒ اور حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے شہید مجاہدین کی بھی قبریں ہیں، جن کی دیکھ بھال یہاں کے مسلمان بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں، یہاں اچھی اچھی مسجدیں بھی ہیں، مسجد سرگدواری تو اتنی اونچی ہے کہ کوسوں دور سے نظر آتی ہے، یہاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مشہور خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ اودھی ثم دہلویؒ کا خاندان بھی آباد ہوا، ۱۸۸۱ء کے امپیریل گزٹیر میں ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر نے اجودھیا کے ذکر میں لکھا تھا کہ یہاں چھتیس ۳۶ مسجدیں ہیں۔

یہ شہر بودھ مت کا بھی بڑا مرکز رہا، ایک روایت کے مطابق گوتم بدھ نے یہاں نو یا انیس[9, 19] برس گذارے، ایک زمانہ میں یہاں بودھ مت کے بیس مندر تھے، اور تین ہزار بھکشو رہا کرتے تھے، اب یہ شہر بودھ مت کے آثار سے خالی ہوگیا ہے۔

یہ جین مت کے پانچ پیشواؤں کا بھی مولد اور مسکن رہا، اور یہاں ان کے مندر بھی رہے ہندو تو خاص طور پر اس کو پوتر سمجھتے ہیں کہ ان کی روایت کے مطابق یہیں رام چندر جی پیدا ہوئے حکومت کی، اور مرنے پر جلائے گئے۔

اجودھیا کی سرزمین میں شاید کشش ہے کہ تمام مذاہب کے پیشوا یہاں کھنچ کر آتے رہے اس کی اس اہمیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اس کی مذہبی تاریخیت قائم رہنی چاہیے، اس کو صرف ایک مذہب سے وابستہ کر کے اس کی خصوصی عظمت کو ختم کرنا مناسب نہیں۔

اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر یہاں جہاں اور مسجدیں تھیں وہاں بابری مسجد کا بھی اضافہ ہوا، جس کو انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں اپنے سیاسی مفاد کی خاطر متنازع فیہ بنا دیا، اس کا قضیہ دبا ہوا تھا، مگر فروری ۱۹۸۶ء میں یکایک پھر اٹھ کھڑا ہوا، راقم نے اس سلسلہ میں معارف کی پانچ اشاعتوں میں اس پر شذرات لکھے، جو پورے ہندوستان میں بہت دلچسپی سے پڑھے گئے، اور ہر طرف سے اصرار ہوا کہ اس کو ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کیا جائے۔ اخباروں اور رسالوں میں اس قضیہ پر معلومات فراہم ہوتے رہے، خیال ہوا کہ اس قضیہ کا مزید مطالعہ کر کے مستند اور مربوط معلومات ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو اس کو سمجھنے میں مدد بھی ملے گی، اور بہت سی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں گی، اسی خیال کی عملی کوشش اس کتابچہ میں نظر آئے گی، جو اس وقت ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے پاکستان کی تحریک کے حامیوں نے یہ اثر ڈالا تھا کہ ہندو اور مسلمان

دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں دونوں ایک قوم نہیں ہیں، اسی بنا پر ملک کی تقسیم ہوگئی، ۱۹۴۷ء
کے بعد قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور متحدہ قومیت کا درس زور وشور سے پڑھایا گیا اور یہ مؤثر
بھی ہوتا نظر آیا، ۱۹۴۷ء سے اب تک بکثرت ہندو مسلمانوں کے درمیان خوں ریز اور
تباہ کن بلوے ہوتے رہے، لیکن ملکی پیمانے پر ان کے تعلقات ناخوشگوار نہیں ہوئے، شاید
مسلمانوں کی تحقیر اور تذلیل کی خاطر کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن پاک کی طباعت واشاعت کو
ممنوع قرار دینے کی ایک درخواست بھی ایک انتہاپسند ہندو کی طرف سے پڑی، مگر ریاستی
اور مرکزی حکومتوں کی غیر معمولی ہمدردی اور قانونی چارہ جوئی سے یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا جس سے
مسلمان دونوں حکومتوں کے ممنون ہوئے، پھر شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں سپریم کورٹ میں
مسلمان مطلقہ عورت کے نان نفقہ سے متعلق قرآنی احکام کے خلاف جو فیصلہ دیا گیا اس سے
مسلمانوں میں غیر معمولی اشتعال پیدا ہوا، لیکن پارلیمنٹ نے خیر سگالی اور خیر اندیشی کے جذبہ میں
مسلمان مطلقہ عورت کا جو بل منظور کر لیا تو اس سے عام طور سے مسلمان خوش ہوئے، لیکن
فروری ۱۹۸۶ء میں بابری مسجد کو مندر میں منتقل کر دینے کے عدالتی فیصلہ پر ہندو مسلمان میں
جو غیر معمولی تناؤ پیدا ہو گیا ہے اس سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور
متحدہ قومیت کا جو درس دونوں کو دیا گیا تھا وہ بالکل بھلا دیا گیا۔

خوشی کی بات ہے کہ بعض ہندو اہل قلم اور دانشمندوں نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی
کے قضیہ پر مفید مضامین لکھ کر انتہاپسند ہندوؤں کو اس کے متعلق ٹھنڈے دل سے سوچنے کی دعوت
دی ہے، خود اتر پردیش کے وزیر پنڈت لوک پتی ترپاٹھی نے اخبار میں جو ایک لمبا بیان دیا ہے
اس کے بعض حصے سے تو اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کا یہ بیان قابل توجہ ہے کہ جہاں تک
میری معلومات ہیں اجودھیا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، تلسی داس کی رامائن میں بتایا گیا ہے کہ

اجودھیا سرجو ندی میں ڈوب گیا تھا، آج کا اجودھیا اودھ کے نوابوں کا آباد کیا ہوا ہے، پنڈت لوک پتی ترپاٹھی نے یہ بھی کہا کہ رام جنم بھومی کی تحریک امریکہ میں شروع ہوئی، اس تحریک کے نتیجہ میں رتھ یاترا نکالی گئی، مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کو بگاڑنے کے لیے سی۔ آئی۔ اے اجودھیا میں شرارت کر رہی ہے، ان کا یہ بھی بیان ہے کہ ہر قسم کے اشتعال اور جارحیت کے باوجود ہندوستانی مسلمان نہایت ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے مکمل طور پر پُرامن رہے، لیکن وہ طاقتیں جو ہندو فرقہ پرستی کا جواز پیدا کرنا چاہتی ہیں اور ہندو مسلم ٹکراؤ کو گاؤں گاؤں محلہ محلہ پھیلانا چاہتی ہیں، وہ مسلمانوں میں بھی سرگرم ہو گئی ہیں۔ پٹنہ کے ایک ہندی ویکلی وچار بودھ میں ایک مضمون شایع ہوا جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اودھ کے ہندو مسلمان کو لڑانے کے لیے انگریزوں نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازعہ کو جنم دیا، اسی مضمون میں بابر کے اس وصیت نامہ کا ذکر ہے جو اس نے ہمایوں کو دیا تھا، اس کو ہم اس کتابچہ کے اندر نقل کر چکے ہیں، مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اس کی نقل قومی یادگار کے تحفظ کے محکمہ میں محفوظ ہے، اسی مضمون نگار نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ہمایوں نے باپ کے حکم کی پابندی کرتے ہوئے بنارس کے جگن ناتھ مٹھ کو ضلع مرزاپور میں تیرہ سو ایکڑ اراضی معافی میں دے دی، اس کا یہ حکم نامہ آج بھی جگن ناتھ مٹھ میں محفوظ ہے۔

پھر دہلی کے ڈاکٹر آر۔ ایل۔ شکلا اور اسٹیٹ ویکلی کے مضمون نگار چیتا نند داس گپتا نے جو اس سلسلہ میں مضامین لکھے ان کا تفصیلی ذکر اس کتابچہ کے اندر آیا ہے، پھر کچھ ہندو مسلمان دانشوروں کا ایک اجتماع انڈیا انٹرنیشنل سنٹر نئی دہلی میں، ۶ رجون ۱۹۸۶ء کو ہوا، اس میں بابری مسجد کے تنازعہ پر غور و خوض کیا گیا اور اس میں یہ طے کیا گیا کہ سماج کے تمام طبقات تشدد سے احتراز کریں، جذبات و احساسات میں بلندی پیدا کریں، ہوشمندی سے کام لیں اور یہ عہد کریں

کہ ملک میں ایک سچا سیکولر اور ایسا جمہوری سیاسی ڈھانچہ مضبوط رہے جس میں سماج کا کوئی طبقہ اپنے آپ کو غیر محفوظ یا عدم توجہی کا شکار محسوس نہ کرے، اور جہاں صحیح معنوں میں مساوات کا دور دورہ ہو۔

اس اپیل پر جن ہندوؤں نے دستخط کیے ان کے نام یہ ہیں: اندر کمار گجرال، راجندر سچر، ہرکشن سنگھ سرجیت، اوم پرکاش سری واستو، دیوان بیریندر ناتھ، ایرکموڈور اے۔ ایل ہنگل، لفٹنٹ جنرل ایس ارورا، راجندر پوری، چندر شیکھر، بھائی ویدیہ، اے۔ ڈی گری، اندر موہن، آنند رام جیسوال، گووند نارائن، سی راجیشور راؤ، دھرم ویر سنہا، یشونت سنہا وغیرہ۔

ہم بھی مسلمانوں کی طرف سے یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ بابری مسجد، رام جنم بھومی توڑ کر اس کی جگہ پر بنائی گئی تو ایسی غاصبانہ قبضہ کی زمین پر جو مسجد بنائی گئی وہ مسمار کر دیئے جانے کے لائق ہے، اس میں نماز پڑھنے کا فتویٰ کوئی فقیہ اور عالم نہیں دے سکتا، مگر یہ ثابت کرنے کے لیے مستند، معتبر اور معاصر ماخذوں کے حوالے چاہئیں، انگریزوں کے زمانہ کے لکھے ہوئے گزٹیروں یا آثار قدیمہ کی رپورٹوں، یا سنی سنائی روایتوں کے حوالے قابل قبول نہیں ہو سکتے، ایسے مسلمان مصنفوں کی تحریریں بھی قابل توجہ نہیں جو نفرت، جنگ وجدل اور اشتعال بھری فضا میں لکھی گئیں، یا انگریزوں کی پھیلائی ہوئی نفرت کے بعد قلم بند ہوتی رہیں، انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی غرض سے بار بار اس پر زور دیا کہ وہ تو جہاں جاتے ہیں، دوسروں کی عبادت گاہوں کو مسمار کر دیتے ہیں، یہی ان کا مذہبی اصول رہا ہے، ان انگریزوں کو لکھتے وقت یہ خیال نہیں رہا کہ عیسائیت کی تاریخ دوسروں اور خصوصاً مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو برباد اور مسمار کرنے سے بھری پڑی ہے، سسلی میں مسلمانوں کی حکومت تقریباً ڈھائی سو سال رہی، لیکن عیسائیوں کا اقتدار وہاں ہوا تو خود ایک عیسائی مورخ ایس۔ پی۔ اسکاٹ بڑے دکھ اور درد

کے ساتھ لکھتا ہے کہ "سسلی میں مسلمانوں کے ہزاروں محل اور مسجدیں تھیں، ان کی خوبصورتی، موزونیت، اور شان مسلمانوں کے شہروں کے لیے مایۂ ناز تھیں، اب ایک بھی وہاں باقی نہیں، ان کو یا تو عوام کالانعام نے پامال کر ڈالا، یا وہ کلیسا کے تعصب کی نذر ہو گئیں۔" (اخبار الاندلس ج ۲ ص ۷۵)

اسپین میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو برس تک حکومت کی، اس کو خوبصورت مسجدوں سے آراستہ کیا، قرطبہ اور الحمرا کی شاندار مسجدیں دنیا میں فن تعمیرات کے لحاظ سے بہترین نمونے سمجھی جاتی ہیں، مگر عیسائیوں نے اسپین کی ہزاروں مسجدوں کو مسمار کر دیا، ان کی جگہوں پر کلیسا، یا مکانات بنا لیے، صلیبی جنگ کے زمانہ میں یروشلم کی مسجدوں کو صلیبیوں نے جس طرح منہدم کیا اس کی بڑی طویل المناک داستان ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں روسیوں نے ترکوں کے خلاف کریمیا میں جنگ کی تو ایک یورپین مورخ ایڈورڈ کریسی کا بیان ہے کہ روسی فخر کرتے تھے کہ اس حملہ میں انھوں نے چھ ہزار مکانات اور اڑتیس مسجدیں جلا دیں۔

یہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان فاتحوں اور لشکریوں نے کسی مندر کو بھی نقصان نہیں پہونچایا، ان کے ہاتھوں سے بعض مندر ضرور منہدم ہوئے، ان کا انہدام کس طرح ہوا، ذرا اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، مسلمانوں کے دور حکومت میں ان کو تین قسم کے ہندوؤں سے سابقہ پڑا: (۱) حربی (۲) نیم حربی و نیم وفادار (۳) وفادار اور اطاعت گذار، حربی تو وہ ہندو تھے جو مسلمانوں سے زیادہ تر علاقائی حکومت کی خاطر برابر لڑتے رہے، اور ان کو ملک بدر کرنے کی فکر میں رہے، جنگ و جدل میں ایسے حربی ہندوؤں کے علاقہ میں بعض مندر ضرور مسمار کیے گئے، ان کے مسمار کرنے میں کوئی مذہبی جذبہ نہ تھا، بلکہ اس میں جنگجو یانہ جذبہ کارفرما رہتا تھا، ایسی مثالیں بھی ہیں کہ حربی ہندو غالب آئے تو مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو منہدم کرنے میں دریغ نہ کیا، زیر نظر کتابچہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں

بھیم سنگھ نے گجرات میں ۳۰۰ مسجدوں کو جلا دیا، نیم حربی اور نیم وفادار ہندو وہ تھے جو لڑائی میں ہارنے کے بعد صلح کا معاہدہ کر لیتے، اور اطاعت گذار بن جاتے، مگر جب مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوتی تو اپنی علاقائی حکومت قائم کرنے کے لیے لڑائی اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور بعض اوقات مندروں کو اپنی سرکشی اور بغاوت کا اڈہ بنا لیتے، مسلمان لشکری ان کی سرکشی کو دبانے میں ان کی ان عبادت گاہوں کو بھی نقصان پہونچا دیتے، یہ بات اب آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے جب کہ امرتسر میں سکھوں کے سورن مندر یعنی گولڈن ٹمپل میں حکومت کی فوج کشی ہوئی، اور اس میں اکال تخت کو بالکل مسمار کر دیا گیا، حکومت ہند کی فوج کشی کی ضرورت یوں ہوئی کہ یہ دہشت پسندوں، شر انگیزوں اور حکومت ہند کے خلاف باغیوں کا مرکز بن گیا تھا اور وہاں بہت بڑی تعداد میں مہلک اسلحے جمع کر لیے گئے تھے، ان کی دہشت پسندی و شر انگیزی کو دبانے کے لیے فوج کشی لازم تھی، اسی طرح کی کارروائی مسلمان حکمراں بھی اپنے زمانہ میں باغیوں کے خلاف کرتے رہے، اگر سکھ یہ کہیں کہ حکومت ہند نے اپنی مذہبی تعصب اور عداوت میں اکال تخت کو مسمار کیا تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا؟ بالکل نہیں، مندروں کے خلاف اورنگ زیب کے فوجی اور سیاسی اقدام کو اسی عینک سے دیکھنے کی ضرورت ہے، ہندوؤں کی تیسری قسم اُن لوگوں کی تھی جو وفادار اور اطاعت گذار ہوئے تو ان کی عبادت گاہیں محفوظ رکھی گئیں، یہی وجہ ہے کہ آگرہ اور دہلی کے وفادار اور امن پسند ہندوؤں کے مندروں کے انہدام کا ذکر نہیں ملتا، بعض مندر ایسے بھی تھے جو فحاشی کے اڈے بن گئے تھے، خود ہندوؤں کے ایما سے ایسے مندر منہدم کیے گئے۔

خود ہمارے برادران وطن کو بھی سوچنا ہے کہ سیکڑوں برس کی گئی گذری باتوں کے انتقام کی آگ میں ملک کو جھلسا کر رکھ دینا کہاں تک وطن دوستی کا ثبوت دینا ہوگا، اگر

یہاں کے لوگوں میں یہی انتقامی جذبہ پیدا ہوتا رہا تو پھر وہ صرف اسی کا جائزہ لیتے رہیں گے کہ وشنو مندر کے پجاریوں نے کتنے شیو مندروں کو منہدم کیا، اور شیو مندروں کے حامیوں نے کتنے وشنو مندروں کو ڈھایا، یا ہندو مت کے پیروؤں نے بودھ مت کی کتنی عبادت گاہوں اور خانقاہوں کو مسمار کیا، یا بودھ مت والوں نے ہندوؤں کے کتنے مندروں کو برباد کیا، یا جین مت کے حامیوں نے ہندوؤں اور بودھوں کی کتنی پوتر جگہوں کو تہس نہس کیا اور خود ہندوؤں اور بودھوں نے جین مت کے کتنے مقدس مقامات کو برباد کیا، اگر ان کی تفصیلات قلمبند کی جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی، یہ صحیح ہے کہ ہندوؤں نے ان مندروں کی فہرست تیار کر رکھی ہے جن کو مسلمانوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں توڑ پھوڑ کر ختم کیا لیکن مسلمانوں کی مستند کتابوں میں بھی یہ تفصیل موجود ہے کہ ہندوؤں نے خود مسلمانوں کے دور عروج میں کتنی مسجدیں شہید کیں، سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد تو سرکاری رپورٹ کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ بے شمار مسجدوں سے مسلمان بے دخل کر دیے گئے، اگر ملک میں اقتصادی، صنعتی اور تجارتی اسکیموں کے ماسٹر پلان بنانے کے بجائے ان ہی کی تفصیلات لکھی گئیں، اور ان سے انتقامی جذبات ابھرے، تو پھر بھارت ورش میں انتقامی غیظ و غضب کی آگ کا صرف دریا ہی بہتا رہے گا، پھر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ یہ ملک دوستی یا ملک دشمنی ہوگی، وطن دوستی تو اس میں ہے کہ یہاں کے لوگوں کے دلوں کو جوڑا جائے، نہ کہ توڑا جائے، ایک دوسرے سے یگانگت، موانست اور محبت پیدا کی جائے، نہ کہ باہمی نفرت، عداوت اور خصومت کے شعلے فروزاں کیے جائیں۔

ع جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

یہ کتابچہ جس جذبہ سے لکھا گیا ہے، خدا کرے اسی جذبہ سے پڑھا جائے، بابری مسجد کے

کتبات ہی سے ظاہر ہو گا کہ یہ مسجد محض عبادت کرنے کے لیے بنائی گئی، رام جنم بھومی مندر سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور ۱۵۲۸ء سے ۱۸۵۵ء تک یہ مسجد ہی رہی، پھر ۱۸۸۵ء کے مقدمہ میں بھی یہ مسجد تسلیم کی گئی، اس کا باضابطہ رجسٹریشن بھی مسجد ہی کی طرح ہوتا رہا، مگر جو اس کے قائل ہوتے گئے کہ اجودھیا صرف ہندوؤں ہی کی جگہ بن کر رہے، اور ملک میں جس کی اکثریت ہے، اسی کی مرضی ہر معاملہ میں تسلیم کی جائے، وہی اس مسجد کو مندر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر تاریخ میں بعض غلطیاں ایسی بھی ہو جاتی ہیں جن سے غلطی کرنے والی قوم بے خبر رہتی ہے، لیکن ان کے مضرت رساں اثرات صدیوں تک قائم رہتے ہیں۔

اس کتابچہ کی تیاری میں کلکتہ کا بھی سفر کرنا پڑا، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں الگزنڈر کننگھم کی رپورٹ اور ۱۸۸۰ء کے فیض آباد گزیٹیر سے استفادہ کیا، ان کے اقتباسات لینے میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر قمر الدین اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے مولوی عبدالخلاق ندوی نے مدد پہونچا کر ممنون کیا، ۱۹۵۵ء کے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جرنل کے ایک شمارہ میں انڈولوجی کے بہت بڑے ماہر پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے ایک طویل مضمون میں رام چندر جی کے متعلق کچھ ایسی باتیں لکھی تھیں جن پر ان کی بڑی نکتہ چینی ہوئی کہ انھوں نے رامائن کے قصہ کو ہومر سے مستعار بتایا ہے، ان کی طرف سے جواب تھا کہ انھوں نے رامائن کو تو مستعار قصہ نہیں کہا لیکن ان کے نزدیک دس سروں والے راکشش کا وجود یونانی تخیل کی صدائے بازگشت ہے کیونکہ ہندوؤں کے قدیم ترین خرافاتی ادب میں ایسے راکشش کا ذکر نہیں ملتا، انھوں نے بعض بہت ہی پرانے شواہد سے اس پر بھی بحث کی کہ رام اور سیتا بھائی بہن تھے یا ازدواجی رشتہ میں منسلک تھے، اس سے بھی ایک علمی سنسنی پھیلی، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اس شمارہ کو تو دیکھا مگر اس سے اقتباسات لینے کا وقت نہ ملا، کلکتہ کے قیام میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی طرف سے بھی کچھ مفید لٹریچر حاصل ہوا

لکھنؤ سے محب عزیز جناب محی الدین نے سنہ ۱۹۰۵ء اور سنہ ۱۹۶۰ء کے فیض آباد گزیٹیر کے اقتباسات بھیج کر گراں بار کیا، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کے نگراں مولانا محمد مرتضیٰ صاحب نے حدیقہ شہدا کا فوٹو اسٹیٹ اور قیصر التواریخ یا تواریخ اودھ کا نسخہ بھیج کر شکر گذار ہونے کا موقع دیا، اعظم گڈھ کے مشہور وکیل جناب شاہ غلام خالد نے مختلف مقدمات کی اصطلاحات کو درست کرنے میں مدد کی، اس کے لیے بھی ہم ان کے ممنون ہیں، اس کتابچہ کی تیاری میں انھوں نے ہر طرح ہمت افزائی کی، دارالمصنفین میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی، محمد مجید زبیری، مولوی عبید اللہ کوٹی ندوی، مولوی حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی، مولوی عبدالمبین ندوی، مولوی محمد عارف عمری، مولوی عبدالباری اور شاہ ظفر الیقین نے ہر طرح کی سہولتیں پہونچائیں، مولوی عمیر الصدیق ندوی دریابادی نے بعض انگریزی اقتباسات کے ترجمے کر کے میرا کام ہلکا کیا، مولوی ابوالبقار ندوی نے بعض مقدمات کے فیصلوں کے فوٹو اسٹیٹ لکھنؤ میں حاصل کیے، مولوی عبدالمبین نے بھی اس سلسلہ میں لکھنؤ کا سفر کیا۔

مسلم انڈیا مرتبہ جناب سید شہاب الدین ایم۔ پی کے مختلف شماروں سے بڑی مدد ملی، الحسنات اسلامی اردو ڈائجسٹ اور رسالہ دارالعلوم دیوبند سے بھی پورا استفادہ کیا گیا، ان رسالوں سے کے حوالے اس کتابچہ میں جابجا درج ہیں۔

پھر عرض ہے کہ اس کتابچہ کی ترتیب دینے میں بقائے باہمی، جذباتی ہم آہنگی اور وطن دوستی کے جذبات غالب رہے، خدا کرے اس کے مطالعہ سے اچھے اثرات مترتب ہوں، یہ میری کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، اس لیے اس کے ٹائٹل پر میرا نام نہیں ہے، اس میں صرف ہر قسم کے معلومات جمع کر دیے گئے ہیں، اس لیے اس کی حیثیت محض ایک معلوماتی کتاب کی ہے، اس میں تفہیم سے متعلق مختلف قسم کے معلومات جمع کرنے میں تکرار بہت زیادہ پیدا ہو گئی، مگر یہ ناگزیر تھی۔

۱۵ دسمبر سنہ ۱۹۸۶ء

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابری مسجد

بابری مسجد کے کتبات آج کل بابری مسجد کا قضیہ پورے ہندوستان میں اٹھ کھڑا ہوا ہے، اس مسجد کے متعلق ملک میں غور و فکر کی لہریں مختلف طریقوں سے بہ رہی ہیں، پہلے اس کی تاریخی حیثیت پر غور کرنا ہے، اس کی تاریخی حیثیت تو اس کے کتبہ سے ظاہر ہوتی ہے، اس مسجد پہ لکھے ہوئے کچھ اشعار تو یہ ہیں:

بفرمودِ شاہ بابر کہ عدلش ۔۔۔ بنائیست تا کاخ گردوں ملاقی

بنا کرد ایں مہبطِ قدسیاں را ۔۔۔ امیر سعادت نشاں میر باقی

بود خیر باقی و سالِ بنایش ۔۔۔ عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

۹۳۵ھ

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ بابر کے حکم سے جس کی عدل پروری کا خ گردوں سے ملتی ہے، اس کی بنا پڑی، سعادت حاصل کرنے والے ایک امیر میر باقی نے اس کو بنوایا، جو اب فرشتوں کے اترنے کی جگہ ہے، خدا کرے یہ کار خیر باقی رہے، اسی لیے اس کی تعمیر کا سال "بود خیر باقی" (۹۳۵ھ) ہے۔

دوسرے کتبہ میں یہ تین اشعار ہیں :

بنام آں کہ دانا ہست اکبر   کہ خالق جملہ عالم لامکانی
درود مصطفےٰ بعد از ستایش   کہ سرور انبیائے دو جہانی
فسانہ در جہاں بابر قلندر   کہ شد در دور گیتی کامرانی

ان اشعار میں پہلے اللہ تعالیٰ کو دانا، اکبر، جملہ عالم کا خالق اور لامکان کہا گیا ہے، پھر اس حمد کے بعد محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا گیا ہے، اور آپ کو دونوں جہان کا سردار کہا گیا ہے، پھر آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ بابر قلندر کا افسانہ دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اس لیے کہ وہ اس دنیا میں کامران رہے۔

اوپر کے چھ اشعار مسز بیوریج کی بابر نامہ ضمیمہ میں درج ہیں، مگر رسالہ دارالعلوم کے ایڈیٹر جناب حبیب الرحمٰن قاسمی نے اس مسجد کے پورے کتبات بڑی محنت سے حاصل کیے ہیں، ان کے بیان کے مطابق ایک کتبہ پتھر کی دو میٹر لمبی اور ۵۵ سینٹی میٹر چوڑی تختی پر ہے جو مسجد کے مسقف حصہ کے درمیانی مرکزی در کے اوپر نصب ہے، اس پر بسم اللہ کے علاوہ تین سطروں میں آٹھ اشعار لکھے ہوئے ہیں، جن میں پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں بانی کا نام نسبت کی صراحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے، اور آٹھویں شعر کا دوسرا مصرع تعمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم		
بنام آنکہ دانا ست اکبر	کہ خالق جملہ عالم لامکانے	درود مصطفےٰ بعد از ستایش
کہ سرور انبیاء زبدہ جہانے	فسانہ در جہاں بابر قلندر	کہ شد در دور گیتی کامرانے
چناں کہ سطلع کشور گرفتہ	زمیں را چوں مبارز آسمانے	دراں حضرت یکے سید معظم

کہ نامش میر باقی اصفہانے	مشیر سلطنت تدبیر ملکش	کہ این مسجد حصار بہستانے
خدایا در جہان تابندہ ماند	کہ خیر و بخت و تخت و زندگانے	درین عہد و درین تاریخ بہما
کہ نہ صد بیخ و سی بودہ نشانے	(ان دو سطروں میں عربی میں کچھ لکھا ہوا ہے جو پڑھا نہیں جا سکا)	

مسجد کے اندرونی حصے میں منبر کے پاس دائیں طرف یہ کتبہ ہے:

بہ نشانے بابر خدیو جہاں　　　بسا بلکہ با کاخ گردوں عنان

بنا کرد این خانۂ پائیدار　　　امیر سعادت نشان میر خان

بماند ہمیشہ چنیں بانیش　　　چناں شہریار زمین و زمان

بائیں جانب یہ کتبہ ہے:

بفرمودہ شاہ بابر کہ عدلش　　　بنائیست با کاخ گردوں ملاقی

بنا کردہ این مہبط قدسیان را　　　امیر سعادت نشان میر باقی

بود خیر باقی و سال بنایش　　　عیاں شد چو گفتم بود خیر باقی

۹۳۵

جناب حبیب الرحمٰن صاحب کا بیان ہے کہ ۲۷ر مارچ ۱۹۳۴ء میں اجودھیا میں فرقہ دارانہ فساد ہوا تو اس موقع پر فسادی آخری دونوں کتبوں کو اکھاڑ لے گئے، بعد میں منبر کے بائیں جانب والے کتبے کی ایک نقل تیار کرکے تہور خان ٹھیکیدار نے نصب کرا دیا، البتہ دائیں جانب کی نقل وہ نہ کرا سکے، مگر ان تینوں کتبوں کی نظم اور اس کا فوٹو ضمیمہ فارسی و عربی ہندوستانی کتبات ۱۹۶۵ء ناگپور میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کتبوں کے معانی ہم یہاں مسلسل طریقہ سے پھر لکھ دیتے ہیں:

اس نام پر جو کہ دانا اور رب سے بڑا ہے، اور جملہ لامکانے کا خالق ہے، اس کی تعریف کے بعد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود ہو، جو نبیوں کے سردار اور دنیا کے

خلاصہ ہیں، بابر قلندر کا فسانہ دنیا میں ہے، اس لیے کہ وہ دنیا کے دور میں کامیاب رہے جب کہ انھوں نے ملک کے مطلع کو حاصل کیا تو زمین آسمان سے لڑنے لگی، اسی شہر میں ایک عظمت والے سید ہیں، ان کا نام میر باقی اصفہانی ہے، وہ سلطنت کے مشیر ہیں، اور ان کی تدبیر سے یہ مسجد چاندی کی جگہ جیسے لوگوں کا حصار بن گئی۔

اے خدا اس دنیا میں نیکی، بخت، تخت اور زندگی چمکتی رہے، اسی عہد میں اور اسی مبارک تاریخ یعنی ۹۳۵ھ میں یہ بنی۔

دنیا کے مالک بابر کی منشا سے جس کی عنان کا رخ گردوں ہے، اس خانۂ پائیدار کی بنیاد امیر سعادت نشان میر خان نے ڈالی، ایسے بانی ہمیشہ باقی رہیں، اور ایسے زمین وزمان کے شہریار بھی۔

بابر کے فرمانے پر جس کی عدل پروری آسمان کے محل سے ملتی ہے، اس کی بنیاد سعادت حاصل کرنے والے ایک امیر میر باقی نے فرشتوں کے اترنے کی جگہ کی بنیاد ڈالی، یہ نیکی باقی رہے اس لیے اس کی بنیاد کے سال کی تاریخ اس سے ظاہر ہوئی جب میں نے کہا "بود خیر باقی"۔

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ اس مسجد کو بابر کے ایک امیر میر باقی نے بنوایا، "بفرمود شاہ بابر" اور "بخشائے بابر" سے یہ ظاہر ہے کہ بابر کے کہنے یا اس کی خواہش پر یہ بنوائی گئی، یا بابر کے زمانہ میں بنی، اس لیے یہ الفاظ تعظیماً یا رسماً لکھ دیے گئے ہیں،

غاصبانہ قبضہ کی زمین پر مسجد کی تعمیر ناجائز

ان کتبات کی سند کو کسی لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد رام چندر جنم بھومی کو مسمار کر کے بنائی گئی، اگر یہ اس طرح بنائی گئی ہوتی تو اس زمانہ میں بابر یا اس کے حاکم اپنے فاتحانہ غرور اور پندار میں یہ ضرور لکھ دیتے کہ شرک و کفر کی ایک جگہ کو منہدم کر کے یہ مسجد تعمیر کی گئی، اور اس وقت یہ لکھنے سے

کون ان کو روک سکتا تھا، بابر کی طرف فقہ بابری منسوب ہے، اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی غاصبانہ قبضہ کی زمین پر مسجد نہیں بنائی جا سکتی ہے، اور اگر ایسی کوئی مسجد بنی تو علماء اور مفتیان وقت اس میں نماز پڑھنے کا کبھی فتویٰ نہیں دے سکتے، اور اسلام کی گذشتہ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں، اگر کسی عبادت گاہ کے کسی حصہ کو بھی زبردستی حاصل کرکے مسجد میں شامل کیا گیا تو بعد میں وہ توڑ دیا گیا، بنوامیہ کے زمانہ میں ولید بن عبدالملک نے دمشق میں ایک شاندار مسجد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا، اس کے لیے زمین کی کمی پڑی، اس نے پڑوس کے ایک گرجے کی زمین عیسائیوں سے مانگی، انھوں نے یہ کہہ کر زمین دینے سے انکار کیا کہ خوشی سے تو نہیں دے سکتے، زبردستی سے اگر لی گئی تو لینے والے کو کوڑھ ہو جائے گا، ولید کو غصہ آ گیا، اور یہ کہہ کر زمین لے لی کہ دیکھیں کیسے کوڑھ ہوتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ آیا تو عیسائیوں نے ان سے شکایت کی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلفائے راشدینؓ کے اسوۂ حسنہ پر چلتے تھے، انھوں نے حکم دیا کہ مسجد کا وہ حصہ جو گرجے کی زمین پر تعمیر ہوا ہے وہ فوراً منہدم کرا دیا جائے، اور سرکاری خرچ سے گرجے کی تعمیر از سرِ نو ہو۔ (خطبات شبلی ص ۵۰،۰۴)

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب کوئی ملک یا علاقہ فتح ہوا، اور وہاں کے لوگوں نے آپ کی حکومت تسلیم کرلی تو ان کو آپ برابر یہ حقوق دیتے رہے کہ ان کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کے سفر، ان کی مورتیں اللہ کی امانت اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے، اور نہ ان کے کسی حق میں دست اندازی کی جائے،

اور نہ ان کی مورتیں بگاڑی جائیں، کوئی اسقف اپنی اسقفیت، کوئی راہب اپنی رہبانیت، کلیسا کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے، جو بھی کم یا زیادہ ان کے پاس ہے، اسی طرح رہے گا، اس کے زمانہ جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ ان سے فوجی خدمت نہیں لی جائے گی اور نہ ان پر عشر لگایا جائے گا اور نہ اسلامی فوجیں ان کی پامالی کریں گی، ان میں سے جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ (فتوح البلدان بلاذری، ص ۷۶، مطبوعہ مصر، اور دین رحمت مطبوعہ دارالمصنفین ص ۲۲۸ - ۲۳۷)

اسی پر صحابۂ کرام کا عمل رہا، اور اگر تعصب کی عینک اتار کر ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی روایت سندھ میں محمد بن قاسم کی آمد سے بہادر شاہ ظفر تک قائم رہی، اور اگر مسلمان حکمرانوں کا یہ مذہبی فریضہ تھا کہ وہ مندروں کو مسمار کریں، بتوں اور مورتوں کو توڑ کر ہندوستان کی سرزمین کو ان چیزوں سے پاک کر دیں، تو شاید یہاں اتنے لاکھوں اور کروروں مندر دکھائی نہ دیتے، جو قدیم زمانہ سے اب تک موجود ہیں، اگر اسلام کی مذکورۂ بالا تعلیمات کی کہیں اور کسی زمانہ میں کسی سے خلاف ورزی ہوئی تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس سے جرم کا ارتکاب ہوا۔

بابر کی رواداری بابر کے متعلق یہ بھی گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے یہاں آتے ہی مندروں اور مورتیوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا، کیونکہ جس سال یہ مسجد بنی ہے، اسی سال اس نے ہمایوں کے لیے یہ وصیت نامہ لکھ کر چھوڑ رکھا تھا:

"اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی

تعصبات کو مٹادو، اور ہر مذہب کے طریقہ کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلاف کو نظر انداز کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملاؤ، جس طرح انسانی جسم ملا رہتا ہے تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے، یکم جمادی الاول ۹۳۵ھ (انڈیا ڈیوائڈڈ ص ۳۹ تیسرا اڈیشن)

یہ تحریر اسی سال کی ہے جس سال بابری مسجد بنائی گئی، اگر یہ رام جنم بھومی مندر کو منہدم کر کے بنائی جاتی تو وہ اپنے لڑکے ہمایوں کو یہ وصیت نامہ کیونکر لکھ سکتا۔

اس وصیت نامہ کو ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ نے اپنی مشہور کتاب انڈیا ڈیوائڈڈ میں درج کر کے بابر کو مذہبی تعصب سے بالاتر تسلیم کیا ہے

ہندو مورخین کی شہادت | اسی طرح پروفیسر سری رام شرما کی کتاب مغل امپائر آف انڈیا کی جلد اول کے ص ۵۴ - ۵۵ پر بھی بابر کا یہ وصیت نامہ درج ہے، اسی لیے پروفیسر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی ہے کہ بابر نے کسی مندر کو منہدم کیا، اور کسی ہندو کی ایذا رسانی کی محض اس لیے کہ وہ ہندو ہے، (ص ۵۵ - ۱۹۴۵ء ایڈیشن)

جناب رام پرشاد کھوسلہ پٹنہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، انھوں نے ۱۹۳۴ء میں مغل کنگ شپ اینڈ نوبیلٹی لکھی، اس میں بابر کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بابر کی تزک میں ہندوؤں کے کسی مندر کے انہدام کا ذکر نہیں اور نہ یہ ثبوت ہے کہ اس نے کفار کا قتل عام ان کے مذہب کی وجہ سے کیا، وہ نمایاں طور پر مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے بری تھا، (ص ۲۰۷)

بابر اور مندروں کا احترام | بابر کی تزک بابری کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ تو ہندوؤں کے مندروں کا ذکر لطف لے لے کر کرتا ہے، مثلاً جب وہ گوالیار کے قلعہ میں پہونچا تو وہاں کے عالی شان بت خانہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ یہاں کے تالاب کے مغرب میں ایک عالی شان بت خانہ ہے، سلطان شمس الدین التمش نے اس بت خانہ کے پہلو میں ایک مسجد بنائی ہے، یہ بت خانہ اتنا بلند ہے کہ قلعہ میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں، دھول پور کے پہاڑ پر سے گوالیار کا قلعہ اور بت خانہ خوب نظر آتا ہے، کہتے ہیں کہ اس بت خانہ کا سارا پتھر وہاں کے تالاب کو کھود کر حاصل کیا گیا ہے؛

(اردو ترجمہ ص ۲۳۲، انگریزی ترجمہ بابر نامہ ص ۶۱۰)

اگر بابر چاہتا تو گوالیار کے اس عالیشان بت خانہ کی تعریف کرنے کے بجائے اس کو منہدم کر دیتا، اس کے لیے اس ملک کے مندر اور بت خانے بالکل نئی چیزیں تھیں، اس لیے ان کو شوق سے دیکھتا رہا۔

گوالیار کے بت خانہ کے پہلو میں سلطان شمس الدین التمش کی بنائی ہوئی ایک مسجد سے یہ ظاہر ہے کہ التمش نے بھی اس کے بغل میں بت خانہ کو منہدم کرنا پسند نہیں کیا۔

بابر پھر اُردوا کی طرف جاتا ہے تو لکھتا ہے کہ اس کے اطراف کے پہاڑ کا ایک ٹکڑا تراش کر چھوٹے بڑے بتوں کی مورتیں بنائی گئی ہیں، اس کے جنوب میں ایک بڑے بت کی مورت ہے، جو تقریباً بیس گز کی ہوگی، ان سب بتوں کو ننگا بنایا ہے، ان کے ستر کو ڈھکا نہیں ہے۔ (اردو ترجمہ ص ۳۴۳، بابر نامہ ص ۱۲ - ۶۱۱)

بابر چاہتا تو ان برہنہ بتوں کو مسمار کر دیتا، مگر ان کو اسی طرح رہنے دیا، پھر گوالیار کے بت خانہ کی سیر کرنے کو گیا، تو لکھتا ہے کہ بت خانہ میں بعض جائے دُہرے، بعض جائے تہرے والان ہیں، مگر اگلی وضع کے نیچے نیچے، ان کے دروازہ کے پتھر میں مجسم بت کندہ کیے ہوئے بت خانہ کے بعض قطعے مدرسوں کی وضع کے ہیں، صدر مقام میں ایک بڑا اونچا برج ہے، جس کے حجرے ایسے ہیں جیسے مدرسوں کے حجرے ہوتے ہیں، ہر حجرے کے اوپر پتھر کی تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں، حجروں میں نیچے کی جانب کے پتھروں میں بت تراشے ہیں، ان مقاموں کی سیر کر کے گوالیار کے غربی دروازہ سے نکل کر قلعہ گوالیار کے جنوب میں ہوتا ہوا رحیم داد کے چار باغ میں جو ہتیا پول دروازے کے سامنے ہے، آکر ٹھہرا۔ (اردو ترجمہ ص ۳۴۴، انگریزی ترجمہ بابر نامہ ص ۱۴ - ۶۱۳)

بابر نے ان مندروں اور بت خانوں کو توڑنے کے بجائے وہاں سیر کر کے ان سے لطف لیا، اور اپنی تزک میں ان کی تفصیل قلمبند کر کے ان کو تاریخی اہمیت دے دی ہے البتہ اس کا اعلیٰ اور بلند جمالیاتی ذوق اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ چمن بندی کے حسن کو بھدی مورتیوں سے ضایع کیا جائے، اردوا کا ایک چمن اس کو بہت پسند آیا، اور اس سے بڑی دلچسپی لی، لیکن اس کے خیال میں اس کا بڑا عیب یہ تھا کہ اس میں طرح طرح کی مورتیاں بنائی گئی تھیں، چمن کی خوبصورتی کی خاطر ان کو وہاں سے برطرف کرا دیا۔ (اردو ترجمہ ص ۳۴۳

بابر نامہ ص ۶۱۲)

بابر کی شخصیت پر ہندوؤں کا تبصرہ

اب تک تمام ہندو مورخین بابر کی شخصیت کی دلآویزی کے قائل رہے ہیں، مغلوں کے آخری دور کے مورخ سجان رائے نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"در داد و عدل مبالغہ فرمودے "

اگر وہ داد و عدل کا قائل تھا، تو پھر وہ کسی مندر کو بلاوجہ کیوں مسمار کرتا۔

پنڈت جواہر لال نہرو بھی بابر کی دلکش شخصیت سے متاثر تھے، وہ اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھتے ہیں کہ :

"وہ نشأۃ ثانیہ کے دور میں نمونہ کا رہنما تھا، مہم جو تھا، آرٹ، لٹریچر اور اچھی زندگی کا شایق تھا "

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو نشأۃ ثانیہ کا نمونہ ہوگا وہ دوسروں کی عبادت گاہوں کو مسمار کر کے ظلم اور دل آزاری کا الزام لینا پسند نہیں کر سکے گا۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی اپنے زمانہ کے مشہور مورخ گذرے ہیں، انھوں نے اپنی تصنیف رائز اینڈ فال آف مغل امپائر میں لکھا ہے :

" بابر میں مذہبی جنون نہ تھا، اس کا رویہ ہندو، افغانی، امراء اور رعایا کے ساتھ مہذبانہ، شریفانہ اور دوستانہ تھا "

پھر وہ ایک لمبے تبصرہ میں رقم طراز ہیں کہ مغل سلطنت کی شان و شوکت صرف اس کی فوجی قوت میں نہ تھی، بلکہ اس کی شان غیر مسلم رعایا خصوصاً راجپوتوں کے ساتھ اس کی مذہبی رواداری میں تھی، پھر اس زمانہ میں کلچر کو جو فروغ ہوا، وہ بھی ایک شاندار کارنامہ ہے

اکبر کو اس کے مرتبہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس پالیسی کا بیج اس کے ممتاز دادا بابر ہی کے زمانہ میں ڈال دیا گیا تھا، اور ایک ایسی سلطنت قائم ہوئی جس کی سیاست میں مذہبی اور طبقاتی اختلاف کا کوئی دخل نہیں رہا، تخت و تاج کی حیثیت ریاست میں خاطر خواہ طریقہ پر رکھی گئی، راجپوتوں کے مسائل، دوستی اور شادی بیاہ کے رشتے سے حل کیے گئے، دربار کے تہذیبی پہلوؤں کو زیادہ اہم قرار دیا گیا، لیکن ان تمام باتوں کی ابتدا بابر کے زمانہ سے ہو گئی تھی، جس نے ایک نئی سلطنت قائم کرنے کا راستہ ہموار ہی نہیں کیا، بلکہ کس طرح حکومت کی جانی چاہیے اس کی پالیسی بنانے کا اشارہ بھی کر دیا۔ اس نے ہندوستان میں ایک ایسا خاندان اور ایک ایسی روایت قائم کی جس کی مثال دوسرے ملکوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ (ص ۶۱)

ہندوستان کے ایسے بڑے محسن اور ایسی دلکش شخصیت کو بابری مسجد کے جھگڑے میں الجھانا ملک کی شاندار روایت کو مجروح کرنا ہے، اور اس کی طرف من گھڑت واقعات منسوب کر کے نہ صرف ہندوستان کے علم اور دانشوری کو بدنام کرنا ہے، بلکہ ملک کی سیکولرزم، قومی یکجہتی اور وطن دوستی کے ساتھ دشمنی کا ثبوت دینا ہے، لیکن اس کا بھی جائزہ لینا ہے کہ بابری مسجد کا تنازعہ کیسے کھڑا ہوا، یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ برطانوی حکومت کی سامراجیت کا شاخسانہ ہے، انگریز مورخین اب بھی کچھ نہ کچھ ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے تکدر، ملال، غم و غصہ پیدا کرتی ہیں۔

آئین اکبری میں اجودھیا کا ذکر | اس قضیہ کا اجودھیا سے تعلق ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ مغلوں کی تاریخ میں اجودھیا کا ذکر کیسے آیا ہے، ابوالفضل نے اپنی آئین اکبری جلد اول حصہ دوم میں اجودھیا کا نام نہیں لیا ہے، لیکن اودھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اودھ ہندوستان

کے بڑے شہروں میں ہے، اس کا طول البلد ۱۱۸ درجہ ۶ دقیقہ ہے، اور عرض البلد ۲۶ درجہ ۲۲ دقیقہ ہے، قدیم زمانہ میں اس کی آبادی ۱۴۸ کوس طول میں اور ۳۶ کوس عرض میں پھیلی ہوئی تھی، اور وہ ہندوستان کی بہت بڑی تیرتھ ہے، سواد شہر میں زمین کھودنے سے سونا نکلتا ہے، یہ شہر راجہ رام چندر کا مسکن تھا، رام چندر تریتا دور کے ظاہری و باطنی ہر دو عالم کے پیشوا مانے جاتے ہیں، شہر کے ایک کوس کے فاصلہ پر دریائے گھاگھرا، دریائے سرو سے مل گیا ہے، اور قلعہ کے پاس سے گذرتا ہے، شہر کے قریب دو قبریں ہیں، جو سات اور چھ گز لانبی ہیں، عام طور پر مشہور ہے کہ یہ حضرت شیث اور حضرت ایوب پیغمبر کے مزارات ہیں، ان قبروں کی بابت عجیب و غریب افسانے ہیں، بعض اشخاص کا بیان ہے کہ رتن پور میں کبیر داس کی قبر ہے، جو سکندر لودھی کے زمانہ میں تھا، کبیر کی بابت مشہور ہے کہ اس پر روحانیت کا غلبہ ہوا، اور وہ مذہبوں کی ظاہری پابندیوں سے آزاد ہو کر فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگا، کبیر داس کے اشعار ہندی زبان میں ہیں، جن سے اس کی حق شناسی اور فقر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ (آئین اکبری جلد دوم ص ۸۰، رتن پور میں کبیر کی قبر نہیں ہے)

اجودھیا میں مسلمانوں کی آبادی | اس اقتباس میں کہیں اس کا ذکر نہیں آیا ہے کہ بابر نے رام چندر جی کی جنم بھومی کے مندر کو توڑ کر ایک مسجد بنائی، اور یہ تو بالکل یقینی ہے کہ بابر کے زمانہ سے پہلے اجودھیا میں مسلمانوں کی آبادی ہو چکی تھی،

اوپر آئین اکبری کے اقتباس سے ظاہر ہوا ہوگا کہ یہاں عام روایت کے مطابق حضرت شیث اور حضرت ایوب کی قبریں بھی ہیں، ان کی اصلیت سے صرف نظر کرنے کے باوجود مسلمانوں کو اس جگہ سے جذباتی لگاؤ رہا، حضرت شیث کی قبر کے احاطہ میں بہت سے بزرگان دین مدفون ہیں، یہاں سالار مسعود غازیؒ کے مجاہدین کی قبریں بھی ہیں، یہاں

...نی بابا، حضرت لعل شاہ باز قلندر، حضرت سید علاء الدین خراسانی، حضرت جمال الدین قاضی قدوۃ
...رت سلطان موسیٰ عاشقانؒ اور پیر کشادیؒ کے جو مزارات ہیں، ان کے حالات پڑھنے سے
...دازہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگان دین بابر سے پہلے اجودھیا آکر سکونت پذیر ہو چکے تھے، اور ان سے
...ے فیوض و برکات حاصل کرتے رہے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا آبائی مکان اجودھیا ہی میں تھا، اور ان کی جائے
...دائش اجودھیا ہی میں بتائی جاتی ہے، اسی لیے ان کے نام کے ساتھ اودھی لکھا جاتا ہے، وہ
...یا سادات حسینی میں سے تھے، اس کے یہ معنی ہیں کہ اجودھیا میں اس وقت سادات بس چکے ہو
...مسلمانوں کے لیے ایک، بلکہ ایک سے زیادہ مسجدیں بنائی گئیں تو کون سے تعجب کی بات ہے۔

...یہ تنازعہ کا آغاز | مغل بادشاہوں کی حکومت کے زمانہ میں رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے
...زعہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا، ان کی حکومت کمزور ہوئی تو اودھ میں نوابوں کی حکومت قائم ہو گئی،
...بھی بے جان ہوتی چلی گئی تو انگریزوں نے اس پر تسلط جمانا شروع کیا، وارن ہسٹنگز (۱۷۷۲-۸۵)
...ے زمانہ ہی سے اودھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ایک امدادی فوج متعین کر دی گئی تھی
...ے کے مصارف نواب کے ذمہ تھے، اس فوج میں وارن ہسٹنگز نے غیر معمولی اضافہ کر دیا، اس کے
...مصارف بھی نواب کو برداشت کرنا پڑا، فوجی مصارف کے لیے جب زر کثیر کی رقم مانگی جانے
...ی تو نواب سے باقاعدہ ادا نہ ہو سکی، وارن ہسٹنگز نے بیگمات اودھ کے زیورات اور جواہرات
...چھین کر یہ رقمیں وصول کیں، اس سے ظاہر ہے کہ اودھ کے نواب انگریزوں کے زیر نگیں ہو گئے
...تھے، لارڈ ویلزلی کے زمانہ میں یہ فوج دس ہزار سے بھی زیادہ بڑھا دی گئی، اس کے مصارف کے لیے
...اب کو اپنا آدھا علاقہ کمپنی کے حوالہ کرنا پڑا، لارڈ لارنس کے زمانہ سے وہاں ایک انگریز ریزیڈنٹ
...ہنے لگا، جو اپنی فوج کی مدد سے ریاست کے نظم و نسق کا نگراں ہو گیا، لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں

نواب واجد علی شاہ نام کے نواب رہ گئے، یہ ساری تفصیلات اس زمانہ کی کسی تاریخ میں پڑھی جا سکتی ہیں، خود نواب واجد علی شاہ نے اپنی مثنوی حزن اختر میں لکھا ہے:

یہ واجد علی ابن امجد علی ۔۔۔ سناتا ہے اب داستاں رنج کی
کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے ۔۔۔ جو طالع تھے بیدار سونے لگے
ہوا حکم جنرل گورنر یہ بار ۔۔۔ کرو سلطنت کو خلا ایک بار
جفاکش کا شاہ اودھ نام ہے ۔۔۔ حکومت کا اختر یہ انجام ہے
جو وہ لارڈ ڈلہوزی اس وقت تھے ۔۔۔ مضامین انھوں نے یہ خط میں لکھے
رعایا بہت تم سے ناراض ہے ۔۔۔ تمھاری ریاست ہے بدنام سے
رزیڈنٹ جرنیل اوٹرم جو تھے ۔۔۔ گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج ۔۔۔ کہ جس طرح دریا کی آتی ہے موج

سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی المشہدی نے اپنی تصنیف قیصر التواریخ یا تواریخ اودھ کی جلد دوم میں لارڈ ڈلہوزی ریزیڈنٹ جنرل سلیمن اور جنرل اوٹرم، نواب واجد علی شاہ کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے اس کی پوری تفصیل لکھی ہے، اسی زمانہ میں اجودھیا کے مسجد و مندر کا جھگڑا اٹھا ہوا، جو ۱۸۵۵ء میں انتہائی خوں ریز تصادم تک پہونچ گیا، اس میں سراسر انگریزوں کا ہاتھ رہا، انھوں نے شروع ہی سے یہ سوچ رکھا تھا کہ اس ملک میں ان کی حکومت اسی وقت تک قائم رہ سکے گی جب تک یہاں کے مختلف فرقوں میں باہمی نفرت پیدا ہوتی رہیگی، اودھ میں ان کا تسلط ہوا تو اجودھیا ان کی سامراجی حکمت عملی کا بڑا اچھا دارالعمل بن گیا اس شہر کو ہندو اپنے لیے ایک پوتر استھان سمجھتے تھے، مسلمانوں کی باضابطہ حکومت دہلی میں ۱۲۰۵ء ہی سے شروع ہو گئی تھی، اس کے بعد وہ جس شہر میں آباد ہوتے وہاں مسجدیں ضرور تعمیر کراتے،

ہوتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکومت میں غیر مسلموں کو جو رعایتیں دی ہیں ان کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں، اگر تکرار ہمارے ناظرین کو گراں خاطر نہ ہو تو پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ قرآن مجید کو تو نہیں مانتے، لیکن ان کتابوں میں سے کسی ایک کو تسلیم کرتے ہیں، جن کا ذکر کلام پاک میں ہے، تو ان کے متعلق اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ اگر اسلامی حکومتوں کے وفادار شہری ہیں تو ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رکھی جائیں، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے، ان کی جان، عزت اور مال کی حفاظت کی جائے، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور اور ان کے جائز کھانے کھا سکتے ہیں، کچھ لوگ ایسے ہیں جو آسمانی کتابوں میں سے کسی کو تسلیم نہیں کرتے، مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، ان میں صابی، مجوسی، ہندو اور بودھ وغیرہ شامل ہیں، اسلام کی تعلیم کے مطابق مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے ہیں، ان کا ذبیحہ بھی نہیں کھا سکتے، ان دو باتوں کے علاوہ اگر وہ حکومتوں کے وفادار ہیں تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اہل کتاب کو دیے گئے ہیں، یعنی ان کی جان، عزت و آبرو، مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت اسلامی حکومت کا فرض ہے، ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ آپ کا کام صرف اللہ کا پیام پہونچا دینا ہے، اگر لوگ اس سے روگردانی کریں تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے، آپ پر نہیں، اس کے جواب دہ وہ ہیں، آپ نہیں، ان سے حساب لینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ (سورۂ مائدہ: ۹۵، غاشیہ: ۲۶)

ان اعلیٰ تعلیمات کے بعد بھی انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم جاری کر رکھی تھی، کہ وہ تو دوسروں پر اپنا مذہب مسلط کرتے ہیں، اور دوسروں کی عبادت گاہیں مسمار کر کے

اپنی مسجدیں تعمیر کرتے ہیں، مسلمان اپنی مسجدیں بنانے میں تو بہت زیادہ محتاط اور پرہیزگار رہے، پہلے ذکر کیا ہے کہ کسی غاصبانہ قبضہ والی زمین پر تو مسجد بنانا بالکل ہی جائز نہیں، اور اگر بنالی جائے تو وہ توڑ دی جائے، مسجد بنانے میں علماء و فقہاء نے بڑے شرائط مقرر کیے ہیں، فقہاء کی یہ رائے تسلیم کرلی گئی ہے کہ جو مسجد ریاکاری یا نام و نمود یا کسی اور غرض فاسد کے لیے بنائی جائے جس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا خیال نہ ہو یا جو مسجد ناپاک مال سے بنائی جائے تو وہ مسجد ضرار کی سی ہے (تفسیرات احمدی، ص ۴۰۳، مدارک علی الخازن ج ۲ ص ۲۶۵) یعنی وہ مسلمانوں کی نہیں، منافقوں کی مسجد ہے،

فقہاء کی یہ بھی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ مسجد بنائے جس میں دوسرے کا حق ہو اور اس کی رضامندی حاصل نہیں کی گئی ہو تو اس حق والے کو اختیار ہے کہ ایسی مسجد کو باطل قرار دے اور اپنا حق لے لے، اس کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک زمین پر کسی کو جوار یا رشتہ کی وجہ سے حق شفعہ حاصل ہے تو اس پر مسجد نہیں بنائی جاسکتی ہے، (فتح القدیر ج ۲ ص ۵۰۴) اسی طرح ایک شخص بیمار ہے یا اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنا گھر بار مسجد میں تبدیل کردے، یا اس نے مرتے وقت اس کی وصیت بھی کردی، مگر اس کے جائز ورثاء وصیت کو تسلیم نہ کریں تو اس کی وصیت جائز نہیں سمجھی جائے گی (فتاویٰ عالمگیری جلد ۲ ص ۵۶۰) اسی طرح بیع فاسد سے خریدی ہوئی زمین پر مسجد بنانے کی اجازت نہیں (فتح القدیر ج ۲، ص ۵۰۷) ناجائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی زمین پر بھی مسجد بنانا درست نہیں ہے، ناجائز حصول کی جو بھی شکل ہو، مثلاً کسی کا گھر زبردستی کچھ لوگ حاصل کرکے وہاں مسجد یا جامع مسجد بنالیں تو ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا، (فتاویٰ عالمگیری ج ۶ ص ۲۱۴) اسی طرح کوئی راستہ ایسا ہو کہ ایک مسجد کے بننے سے چلنے والوں کو نقصان یا تکلیف ہو تو بلاشبہ ایسی مسجد بنانا درست نہیں (فتاویٰ عالمگیری ج ۳ ص ۲۲۹)

مسجد کی تعمیر کے لیے زمین کو حلال طریقہ سے حاصل کیا جانا اس کی صحت کی شرط ہے، اور اس حلال طریقہ کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ اس زمین پر کسی بھی شخص کا کوئی حق نہ ہو، ہدایہ میں ہے کہ اگر ایک شخص نے کوئی ایسی مسجد بنائی جس کے نیچے کوئی تہ خانہ ہو، اس کے بالائی حصہ پر کوئی مکان ہو، بیچ میں مسجد ہو اور اس کا دروازہ کسی راستہ پر کھلتا ہو، اور اگر اس مسجد کے حصہ کو اسی شخص نے اپنی ملکیت سے نکال کر مسجد بنا دیا ہو، تو یہ درست نہیں ہوگا، کیونکہ جب اس نے اس کو باضابطہ فروخت نہیں کیا ہے تو اس کو یا اس کے انتقال کے بعد اس کے وارثوں کو اس حصہ کو فروخت کرنے کا حق باقی رہے گا، صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کی عقلی دلیل یہ دی ہے کہ یہ مسجد اللہ کے لیے خالص نہیں تھی، کیونکہ اس سے بندہ کا حق متعلق ہے، قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ مسجد وہ ہے جس میں کسی کو بھی حق منع حاصل نہ ہو، یعنی اس مسجد پر کسی کا کسی طرح کا کوئی بھی حق نہ ہو (ہدایہ ج ۲، ص ۶۲۵، ۶۲۴) فقہاء کا اس مسلک پر ہمیشہ عمل رہا، موجودہ دور کے فتاویٰ میں بھی اسی قسم کی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً فتاویٰ رضویہ میں ایک استفتار کے جواب میں یہ لکھا گیا ہے کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی شش جہت میں جمیع حقوق عباد سے منزہ ہوں، اگر کسی حصہ میں ملک عبد باقی ہے تو مسجد نہ ہوگی، (فتاویٰ رضویہ ج ۶، ص ۴۰۳) اسی طرح ایک استفتار میں یہ پوچھا گیا کہ مسلمان چاہتے ہیں کہ ہندو زمین دار سے زمین خرید کر مسجد بنائیں، کیونکہ مسلمانوں کے پاس موروثی زمین سے الگ کوئی ایسی زمین نہیں ہے جس پر مسجد یا جامع مسجد بنائی جا سکے، لیکن وہ ہندو زمین دار زمین نہیں بیچنا چاہتا، تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس کے جواب میں یہ فتویٰ دیا گیا کہ اگر وہ ہندو زمین نہیں بیچتا تو پھر مسلمان گھروں ہی میں نماز پڑھیں، (فتاویٰ رضویہ ج ۶، ص ۴۱۶)،

اسی طرح اگر زمین مشترک ہے تو شرکاء کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا جائز نہیں، اور اگر ایسی زمین پر مسجد بنا بھی دی جائے تو اس میں نماز پڑھنے کا ثواب نہیں ہے، بلکہ اس میں نماز ہی نہ پڑھی جائے

(مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ، بحوالہ آداب المسجد مفتی محمد شفیع ص ۲۵) اسی طرح نابالغ کی زمین پر مسجد بنانا جائز نہیں، (تتمہ امداد الفتاویٰ بحوالہ آداب المساجد مفتی محمد شفیع ص ۲۵) فاحشہ عورت نے اگر اپنی حرام آمدنی سے مسجد بنا دی تو وہ مسجد ہی نہیں تسلیم کی جائے گی، اور نہ اس کو اس کا ثواب ملے گا، (مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحیٰ ص ۲۶۰)

جب کسی جگہ مسجد بنانے میں اتنے شرائط ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان یا ان کے فاتح اور حکمراں مندروں کو توڑ کر مسجدیں بناتے رہے ہوں، اوپر کہا گیا ہے کہ مسجد بنانے کے لیے زمین حلال طریقہ پر حاصل کرنا لازمی ہے، اس کے حاصل کرنے میں کسی بندہ کا حق زائل نہ ہوتا ہو، اور زبردستی نہ کی گئی ہو، تو پھر کسی مندر کو توڑ کر وہاں پر مسجد بنانا کیونکر درست، جائز اور صحیح قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ تو مان لیا جا سکتا ہے کہ مسلمان فاتحوں اور حکمرانوں نے جنگ کے زمانہ کے غیظ وغضب میں کسی مندر کو مسمار کر دیا ہو، یا کسی مندر کو سازش، بغاوت یا فحاشی کا اڈہ سمجھ کر اس کو منہدم کر دیا ہو، مگر مندر کو توڑ کر اس کی جگہ پر مسجد بنانا ثابت نہیں کیا جا سکتا، اور اگر کسی مغرور المزاج اور مغلوب الغضب فاتح نے ایسی مسجد بنا دی تو راسخ العقیدہ فقہاء اور علماء کے نزدیک یہ مسجد قرار نہیں دی جا سکتی ہے، یہ بھی قرین قیاس ہے کہ کسی خاص سبب سے توڑے ہوئے مندر کے پاس یا اس سے تھوڑے فاصلہ پر کوئی مسجد بنا دی گئی ہو، مگر مندر کی جگہ ہرگز کہیں مسجد نہیں بنائی گئی، یہ اور بات ہے کہ کسی سیاسی مصلحت یا چرب زبانی سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ مندر توڑ کر مسجد بنائی گئی، انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسی باتوں کی ضرور ترویج کی، مگر ان کو تو واقعہ کے سچ اور جھوٹ ہونے سے غرض نہ تھی، ان کے پیش نظر تو مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنا تھا، وہ پیدا ہو کر رہی، اسی پس منظر کے ساتھ اجودھیا میں مسجد اور مندر کا جھگڑا اٹھا

کر دیا گیا، ایک مورخ یہ سوال کر سکتا ہے کہ یہ جھگڑا مغل بادشاہوں کے دور میں کیوں نہیں شروع ہوا؟ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ہندو اس دور میں دبے سہمے رہے، اس لیے وہ خاموش تھے، حالانکہ اکبر سے لے کر اس کے جانشینوں کے دور عروج تک بڑے بڑے راجپوت سرداران کے لشکر اور دربار میں رہ کر اپنے کارناموں کی وجہ سے خطابات اور امتیازات پاتے رہے، انھوں نے اپنے شاہی آقاؤں کی توجہ اجودھیا جیسے پوتر مقام کے مندروں کی بے حرمتی کی طرف کبھی نہیں دلائی اور شاید وہ اس کو ایک پوتر مقام سمجھ کر یہاں کی تیرتھ کے لیے کبھی آئے بھی نہیں، اس جگہ کی اہمیت برطانوی حکومت کے زمانہ میں زیادہ ہوئی۔ پھر مسمار شدہ مندروں کا مسئلہ اٹھا کر ہندوؤں کے جذبات کو ابھارا گیا، جس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لازمی طور پر باہمی نفرت پیدا ہوئی۔

اس تصفیہ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں انگریز، ہندو اور مسلمان تینوں فریق بن گئے تھے، انگریز اس لیے کہ انھوں نے ہی ہندوؤں کو یقین دلایا کہ ان کے مندروں کو منہدم کر کے مسجدیں بنائی گئیں، اور پھر اس جھگڑے کو چکانے کے لیے ان ہی کی فوج سرگرم عمل رہی، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، ہندو اس لیے فریق بن گئے کہ ان کا مطالبہ ہوا کہ جن مندروں کو توڑ کر مسجدیں بنائی گئی ہیں ان کی تعمیر از سر نو ہو، اور مسجدیں مسمار کر دی جائیں، مسلمان یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے، ان کی دلیل تھی کہ یہ صحیح نہیں کہ یہ مسجدیں مندروں کو توڑ کر بنائی گئی ہیں، یہ باتیں محض زبانی روایتوں سے مشہور کی گئی ہیں، جن کا ثبوت مستند معاصر تاریخوں میں نہیں، بہت بعد کی کسی کتاب میں ان کا ذکر ہے تو وہ قابل قبول نہیں، ان کا اصرار یہ رہا کہ جن مسجدوں میں برابر نمازیں ہوتی رہی ہیں ان میں اسی طرح نمازیں پڑھی جانی چاہئیں،

اجودھیا میں یہ جھگڑا ۱۸۵۵ء میں شروع ہوا، اس کا عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ

اس وقت سے اب تک کوئی ہندو مورخ یا دانشور اپنی کسی معاصر ہندی یا سنسکرت ماخذ سے یہ ثابت نہیں کر سکا کہ اجودھیا کی مسجدیں مندروں کو توڑ کر بنائی گئیں، ہندو صرف زبانی روایتوں، یا انگریزوں کی گھڑی ہوئی تحریروں سے مشتعل ہوتے رہے، سنہ ۱۹۶۰ء میں یو. پی کی حکومت کی طرف سے جو گزیٹیر شایع ہوا، اس میں اجودھیا کے مسجد و مندر کے تنازعہ کے سلسلہ میں کسی ہندی یا سنسکرت ماخذ کا حوالہ نہیں، اگر حوالے ہیں تو مسلمانوں کی لکھی ہوئی تصانیف مرزا جان کی حدیقۂ شہداء اور کمال الدین حیدر حسنی الحسینی المشہدی کی قیصر التواریخ یا تواریخ اودھ کے ہیں۔

حدیقۂ شہداء کا مصنف مرزا جان اجودھیا کے ۱۸۵۵ء کے خون ریز تصادم کا اہم میں شریک تھا، اس کی یہ کتاب فوراً ہی ۱۸۵۶ء میں چھپی، اس میں اس کا انداز بیان مورخانہ کے بجائے اسی قسم کا مجادلانہ اور جنگ جویانہ ہے، جو جنگ و جدل کے زمانہ کی فضا میں عموماً ہوا کرتا ہے، ۱۸۵۵ء کے تصادم میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اور ان کا جو قتل عام ہوا اس سے وہ بہت ہی دلگیر، آزردہ اور مشتعل نظر آتا ہے، اسی لیے اس کی اس کتاب میں بڑا غصہ، طنز، تضحیک، تحقیر، قلم کی شرر باری اور تحریر کی بے اعتدالی ہے، اور اس نفرت کا بھی اظہار ہے جو انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا کی تھی، اس کی کتاب وہاں کی پرانی مسجدوں کے زمانۂ تعمیر کے لیے مستند اور معتبر ماخذ نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ بابر یا عالمگیر کے عہد سے بہت بعد میں مرتب ہوئی، دوسری کتاب قیصر التواریخ یا تواریخ اودھ جو بقول اس کے مصنف ہنری الیٹ سکریٹری اعظم وزیر جنرل بہادر کشور ہند کے ایما پر لکھی گئی، اور ۱۸۹۶ء میں چھپی، یہ ہنری الیٹ وہی ہے جس نے ہسٹری آف انڈیا از ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹورین کی دس جلدیں لکھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ نفرت پیدا کی جو آج تک دور نہ ہو سکی، ظاہر ہے کہ اس کے ایما سے جو کتاب لکھی گئی ہوگی اس میں بھی وہی نفرت دکھائی دے گی جس کے خواہاں انگریز تھے، پھر بھی ان دونوں کتابوں

کی ایسی تحریروں کو نظر انداز کر دیا جائے، تو ان سے بعض مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان ہی کو ہم یہاں پر سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں،

حدیقۂ شہداء کے مصنف کا بیان ہے کہ اجودھیا میں رام دربار کی مسجد فدائی خان صوبہ دار نے بنائی تھی، اس کو ہندوؤں نے یہاں تک مٹایا کہ ایک دو منارے اور ایک کنارے پر تھوڑی دیوار رہ گئی، امجد علی شاہ کے وقت میں اس کی تعمیر کا حکم ہوا تھا، مگر موت نے ان کو فرصت نہ دی، (ص ۵، لکھنؤ ایڈیشن) قلعہ کی مسجد پر لچھمن ہنت نے قبضہ کر لیا ہے، اور وہاں مسلمانوں کا گذر نہیں۔ (ایضاً) ان دونوں مسجدوں کے انہدام کے بعد بیراگیوں کی نظر ہنومان گڑھی کی مسجد پر رہی، حدیقۂ شہداء کے مصنف کا بیان ہے: حسب دستور وہاں (یعنی ہنومان گڑھی میں) اورنگ زیب غازی نے ایک مسجد بنوادی تھی، ہندوؤں کو اس مسجد کے مٹانے میں اصرار رہا (ایضاً ص ۵)

اگر وہاں مندر تھا تو اورنگ زیب مندر کو توڑ کر مسجد نہیں بنوا سکتا تھا، اس نے فتاویٰ عالمگیری بڑی محنت سے مرتب کرایا تھا، اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی غاصبانہ قبضہ کی زمین پر مسجد نہیں بنائی جا سکتی ہے، سرجدوناتھ سرکار اورنگ زیب کے بڑے ناقد اور معاند ہیں، وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں جہاں اورنگ زیب نے مندر کو منہدم کیا، اورنگ زیب کے توڑے ہوئے مندروں کی فہرست میں سرجدو ناتھ سرکار اجودھیا کے کسی مندر کے انہدام کا ذکر نہیں کرتے، پھر قیصر التواریخ میں اس سلسلہ میں ایک محضر کا ذکر ہے، جس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مسجد عالمگیر ہی میں بنی تھی، (ص ۱۱۲)

اس مسجد کا انہدام جس طرح ہوا، اس کی جو تفصیل حدیقۂ شہداء کے مصنف نے لکھی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ۱۲۶۱ھ میں لچھم رالله ناظم درشن سنگھ برہمن ہوا تو اس نے ہنومان گڑھی کے

شیلہ میں ایک احاطہ کھنچوایا، اور وہاں لڑائی کا ایک قلعہ بنوایا، اس کی وجہ سے وہاں کے بیراگی روز بروز زور پکڑتے گئے، اور مسجد کی صورت بگاڑنے لگے، اس مسجد کا ایک حصار بنواکر اس کا نام ہنومان گڑھی رکھا، صبح وشام اس میں پرستش کے شغل جلانے لگے، پھر اس کے طاق، محراب اور منبر کو توڑ کر مسجد کا نام ونشان مٹا دیا، (حدیقۂ شہدا، ص ۷۔۶)

قیصر التواریخ یعنی تاریخ اودھ میں اس مسجد کے انہدام کا ذکر اس طرح ہے:

"زمان سابق میں اودھ کی بلندی پر جس کا نام ہنود نے ہنومان گڑھی رکھا ہے، ایک مسجد بنائے سلاطین ماضیہ تھی، ایک فقیر مسلمان اس کی جاروب کشی کیا کرتا تھا، اور بیلوے مسجد میں بڑا چبوترہ تھا، اس پر عشرہ محرم میں تعزیہ رکھتا تھا، بعد ایک مدت کے ایک فقیر ہندو نے املی کے نیچے جھنڈی گاڑ کر رہا، ایک چھوٹی سی کوٹھری بنائی، اس میں بت رکھ کر مقام ہنومان قرار دیا، عہد جناب غفران مآب نواب برہان الملک بعض ہنود کوتاہ اندیش نے مسجد جو بلندی مذکور پر تھی اسے منہدم کر دیا تھا، فوج قاہرہ سرکاری پہونچی، ان کوتاہ اندیشوں کو سزائے اعمال دے کر بتخانہ کو توڑ کر بدستور سابق بنائے مسجد قائم کی، بعد مرور ایام بیراگیوں نے پھر بت خانہ بنایا، مسجد سے کچھ معترض نہ ہوئے، جب تک حکومت پچھم راٹ وغیرہ علاقہ سرکار سے راجہ درشن سنگھ بہادر کو ہوا، کفار اس دیار کو قوت وشہرت زیادہ ہوئی، اس مسجد کو گرا کر مکان گڑھی میں ملا لیا، اور مسجد واقع رام گھاٹ دربار کو خراب کر کے اس کے صحن میں اپنے مسکن بنانے اور اس کے اندر کوڑا ڈالنے لگے اور سینکڑوں مقابر اہل اسلام کو توڑ کر ان کی اینٹیں اور پتھروں سے بڑی شان وشوکت سے بت خانے بنائے، یہاں تک کہ مسجدیں پست اور بت خانے بلند ہو گئے، (ج ۲، ص ۱۱۰)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی دو مسجدیں شہید کی گئیں، ان مسجدوں کے انہدام سے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، ان کی بازیابی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ان کی

سر براہی پہلے شاہ غلام حسین نے کی، انھوں نے اپنا مورچہ بابری مسجد کو بنایا، وہاں الگزنڈر آر اپنے فوجیوں کو لے کر آ گیا، پھر اس کی مدد کے لیے فیض آباد سے جان ہرسی آ گیا تو بقول مصنف حدیقۂ شہدا بیراگیوں کا گروہ زیادہ شاد ہوا، کیونکہ ان کو یقین تھا کہ انگریز ان کے طرفدار ہیں اور ان کو نقصان نہ پہونچائیں گے، بیراگیوں نے یکایک مسجد (یعنی بابری مسجد) پر حملہ کر دیا، خوں ریز تصادم ہوا، مگر مسلمان لڑتے ہوئے ہنومان گڑھی کے دروازے تک پہونچ گئے، بیراگی کافی تعداد میں مارے گئے، مسلمان مسجد میں لوٹ کر آئے، تو الگزنڈر اور جان ہرسی نے ان کو کہلا بھیجا کہ اب کمر کھول کر بخاطر جمع اپنی مسجد میں رہیں، ان سے اس وقت تک کوئی نہ بولے گا جب تک مسجد (یعنی ہنومان گڑھی کی مسجد) کا فیصلہ نہ ہو جائے گا، ان کی باتوں پر اعتماد کر کے وہ کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے، دونوں انگریزوں نے مسجد کے پاس سے اپنی فوج ہٹا کر دور جا کر قیام کیا گویا بیراگیوں کو پھر حملہ کرنے کا موقع فراہم کرنا تھا، پھر تو ہزاروں کی تعداد میں بیراگی مسجد کے اندر گھس آئے اور مسلمانوں کو قتل کر کے مسجد کے صحن کو لالہ گوں بنا دیا، ان کو اس طرح ذبح کیا جس طرح قصائی گائے ذبح کرتا ہے، قرآن مجید کے پاروں کو جلایا، پھر مسجد کے باہر نکل کر لاشوں کو کچلتے ہوئے گھر کی راہ لی، حدیقۂ شہدا کے مصنف کا بیان ہے کہ پلٹنیں دیکھا کیں، کھڑی رہیں، کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی خبر لیتا، یہ پلٹنیں الگزنڈر اور جان ہرسی ہی کی تو تھیں، دوسرے دن نثار حسین کوتوال نے اسی مسجد کے دروازہ پر گڑھا کھود کر لاشوں کو توپ دیا، (حدیقۂ شہدا ص ۱۸ ـ ۱۰)

اس سانحہ کی تفصیل تواریخ اودھ میں مرزا اعلیٰ علی کی زبانی اس طرح درج ہے، جو اس موقع پر موجود تھے:

"دونوں انگریز اندر میں خود اور مرزا نثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ وہاں سے ہٹ کر بڑی دور درخت کھرنی کے نیچے جا کھڑے ہوئے، ایک ساعت نہ گذری تھی کہ بیراگی ہزاروں گولے سے نعرہ لگاتے

آکر مسجد کو گھیر لیا، اور رجب علی شاہ فقیر کے کوٹھے سے چڑھ کر غلام حسین کے ہمراہیوں پر گولیاں برسانا شروع کیا، اور مسجد میں آکر ۲۶۹ آدمیوں کو ذبح کیا، اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، مسجد میں لہو بہنے لگا، اور قرآن شریف کو جو اکثروں کے حائل تھا، پرزے پرزے کر کے معاذ اللہ پاؤں سے روندا، اور جلا دیا، چنانچہ واسطے تصدیق کے جلے ہوئے ورق بھی ملفوف سرکار کیے، اور جنگلہ جو حکم سرکار سے بجو چاہ مسجد پر تیار ہوا تھا، توڑ ڈالا اور دیوار مسجد کو بھی جزاثر گولی چھلنی کر دیا مقتولین کی بے گور و کفن پڑی رہ گئیں، دوسرے دن مرزا منعم حسین نے در مسجد پر ایک بڑا غار کھدوا کر گل درگل دفن کر دیا، (ج ۲، ص ۱۱۲)

اس قتل عام اور مسجد بابری کی بے حرمتی کے بعد حدیقہ شہدا کے مصنف کا بیان ہے کہ بیراگیوں نے مسجد کے صحن میں آکر ہوم کیا، سنکھ بجایا، وہیں بیٹھ کے موہن بھوگ کھایا، اور کہتے تھے کہ ہنومان جی نے کرپا کی، ملیچھوں سے اجودھیا کو پاک کیا، غرض کوئی بے ادبی اٹھا نہ رکھی متصل اس مسجد کے ایک ٹیلہ تھا مسلمانوں کی دعاؤں کا وسیلہ تھا خواجہ مٹی یا میٹھے؟ اس کا نام تھا، مقابر شہدا کا مقام تھا، قبروں کو کھود کے نیست و نابود کر دیا، اور ایک بت مٹی کا وہاں دھر دیا، لکھنے کہتے ہیں کہ بیراگیوں کی کیا حقیقت تھی، کیا ان کی طاقت تھی، یہ افعال قبیحہ مان سنگھ کے لوگوں سے سرزد ہوئے، (ص ۱۴)

یہ مان سنگھ بظاہر نواب واجد علی کا وظیفہ خوار تھا، مگر وہ دراصل انگریزوں کا خاص آدمی تھا، انہی کے حکم پر چلتا تھا، اسی واقعہ کو تواریخ اودھ میں اس طرح درج کیا گیا ہے، بیراگی جو تھا پہلے مسجد میں آئے، ہوم کیا، سنکھ بجایا، بہت بے ادبیاں کیں، اس کے قریب خواجہ میٹھے کی قبر و شہدائے سید سالار کی تھی، اسے توڑ ڈالا، ظاہر ہے کہ جمعیت بیراگیوں کی اس قدر نہ تھی، لیکن سینکڑوں دوڑے، ملازم راجہ مان سنگھ اور پانڈے، راجہ کشن دت اور زمینداران گرد و پیش

مدد کو پہنچے، دس بارہ ہزار کی کثرت ہوگئی (ج ۲ ص ۱۱۱) اسکے مقابلہ میں شاید تین سو مسلمان مسجد کے اندر تھے، انگریز ریزیڈنٹ کی فوج دیکھتی رہی، وہ کیوں مداخلت کرتی، ان کے منشا کے مطابق یہ بلوہ ہو رہا تھا، اس تصادم کا عجیب و غریب پہلو یہ تھا کہ بیراگیوں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ہنومان گڑھی میں کوئی مسجد تھی، پھر یہ الزام جاتا رہتا ہے کہ اورنگ زیب نے وہاں مندر کو توڑ کر کوئی مسجد بنائی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں ایک مسجد تھی، تواریخ اودھ کے مصنف کا بیان ہے کہ ہنومان گڑھی میں مسجد کو بہت سے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، بلکہ اس میں نماز پڑھی ہے، اور سیکڑوں برس کا محضر قاضی یار علی ابن الدین، قاضی حبیب اللہ کے پاس موجود ہے، (ایضاً، ص ۱۱۲)

اس مسجد کی بازیابی کے لیے مسلمان مولوی امیر علی امیٹھوی کی سرکردگی میں اس لیے اٹھے کہ آج ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کی مسجد کھودی ہے، اگر ایسے ہی مسلمان بودے ہوئے تو کل لکھنؤ میں عمل کریں گے، ہر خانۂ خدا میں ایک بت دھر دیں گے، (حدیقۂ شہدا، ص ۱۸) مولوی امیر علی امیٹھوی اپنے جاں نثاروں کے ساتھ آگے بڑھے، پہلے نواب واجد علی شاہ سے گفت و شنید ہوئی، ایک ملاقات کا ذکر حدیقۂ شہدا کے مصنف نے اس طرح کیا ہے:

> "نواب نے ارشاد کیا کہ آپ اتنی جلدی کیوں کرتے ہیں، ہم کو آپ سے زیادہ خیال ہے، واللہ کفار کی زیادتیوں کا بڑا ملال ہے، مگر کیا کریں، قابو نہیں، صاحب کلان سے مجال گفتگو نہیں، جب سے کلام اللہ کے جلنے کو سنا ہے، دل کباب ہو گیا ہے، کلیجہ پھٹتا ہے، لیکن آپ کو شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا کلام یاد نہیں، دیر آید درست آید کیا قول استاد نہیں، آپ تھوڑے ہی دن تامل کریں، روانگی میں تساہل کریں، ہم حکمت عملی سے مسجد بنوا دیں گے، اور انتقام بے ادبیوں کا بھی لیں گے، (ص ۲۵)

اوپر کے اقتباس میں صاحب کلان سے مراد انگریز ریزیڈنٹ ہے، اس سے ظاہر ہے کہ انگریزوں کے اشارے سے سب کچھ ہو رہا تھا، نواب واجد علی کے قابو سے سب کچھ باہر تھا، وہ تو

تو ان سے گفتگو بھی نہیں کر سکتے تھے، مولوی امیر علی امیٹھوی کو نواب واجد علی کی بے بسی کا پورا احساس ہوا، ان کی گفتگو کو حیلہ جوئی سمجھ کر اپنے عزم کو پورا کرنے کے لیے تیار ہو گئے، اس مہم کی بڑی لمبی تفصیل حدیقۂ شہداء اور تواریخ اودھ میں ملے گی کہ کس طرح مولوی امیر علی آگے بڑھے اور لٹیرے لگران کو فریب میں مبتلا کیا گیا، یہاں تک کہ وہ انگریز کے فوجی سردار بارلو کی توپوں کی زد میں آگئے، بارلو نے ان کو جس طرح ختم کیا ہے اس کا حال حدیقۂ شہداء اور تواریخ اودھ میں تفصیل سے ملے گا، حدیقۂ شہداء میں ہے کہ بارلو کی توپوں سے موت کی گرم بازاری ہونے لگی تو وہ دن روز رستاخیز سے کم نہ تھا زمین و آسمان درہم برہم تھا، ساکن آسمان الامان کہتے تھے، بے گناہوں کو ذبح ہوتے دیکھ کر فرشتے کل یوم ہو فی شان کہتے تھے، امیر المجاہدین یہ کہتے ہوئے شہید ہوئے ؎

سر میداں کفن بر دوش دارم (ص ۵۰)

بارلو کے ساتھ گونڈہ کے تعلقہ دار بھی ہو گئے تواریخ اودھ میں ہے کہ:

"مولوی صاحب اپنے سجادے پر رو بقبلہ گرے اور ابتدا سے ان کی دعا تھی کہ میں کسی مسلمان کے ہاتھ سے نہ مارا جاؤں (یعنی نواب کے کسی لشکری کے ہاتھ سے) خدا نے ان کی دعا مستجاب کی، باقی نمازی گرد ان کی نعش کے پڑے تھے، مثل بنات النعش تلنگوں نے دوڑ کر بارلو سے کہا کہ مجاہدین کا کام تمام کیا، ایک تلنگہ مولوی صاحب کا سر کاٹ کر لایا، بارلو نے اسی وقت از راہ فخر و فتح و فیروزی سمجھ کر روانہ سرکار کیا، جب حضور عالم کو خبر ہوئی حکم کیا یہاں کیوں سر لائے؟ اب چاہتے ہو لکھنؤ میں بھی کوئی ہنگامہ برپا ہو، دو تلنگے اکہ شتر سوار یہ سر لے کر آئے تھے حکم ہوا کہ اس سر کو دھڑ کے ساتھ جا کر بعد ملاحظہ کرانے بڑے صاحب کے (یعنی ریزیڈنٹ جنرل) دفن کر دو، یہ ڈر سے کہ اگر پھیر کر لے جاویں گے، مبادا کوئی مجاہد اسے دیکھ کر چھین لے اور ہمیں مار ڈالے، بڑے صاحب کو ملاحظہ کرا کے معلوم نہیں کہاں سر کو پھینک دیں، سیدھے بارلو کے پاس

چلے گئے" (ص ۱۲۷۔۱۲۶)

اوپر کی لمبی تفصیل سے ناظرین شاید گھبرا اٹھے ہوں گے، مگر اسی پس منظر میں بابری مسجد کا قضیہ سمجھ میں آئے گا، وہ اب خود فیصلہ کریں کہ ہنومان گڑھی کے خون ریز تصادم میں اصلی فاتح کون تھے، بلاشبہ الگزنڈر آرجان ہرسی، بارلو اور اودھ کے ریزی ڈنٹ جنرل یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز تھے، انھوں نے ہی اجودھیا میں مسجد مندر کا تنازعہ کھڑا کیا، اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو اس لیے خوش کیا کہ وہ مسلمانوں سے حکومت چھیننے میں ان کی مدد کریں گے، اور کم از کم اجودھیا کے تصادم میں تو ان کی پوری مدد کی، اجودھیا کے بیراگیوں نے انگریزوں کے زیر سایہ تین چار مسجدوں کو شہید کر لیا تھا، تو ان کے حوصلے بابری مسجد پر قبضہ کرنے کے لیے کیوں نہ بڑھتے، وہ اس کے اندر گھس کر ہوم کر چکے تھے، سنکھ بھی بجا چکے تھے، اور موہن بھوگ بھی کھا چکے تھے، اب صرف اس کو توڑ کر یا تو اور مسجدوں کی طرح صفحۂ زمین سے مٹانا یا اس کو مندر میں منتقل کرنا باقی رہ گیا تھا، مگر اجودھیا کے مسلمان اپنی پسپائی اور قتل عام کے باوجود اپنی ایمانی حرارت اور ملی حمیت کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے، اس شکست و ہزیمت کے بعد انھوں نے مسجد کو بیراگیوں سے خالی کرایا، اور پھر اس کی حفاظت کے لیے مذہبی، قانونی، دستاویزی اور عدالتی سطح پر ہندوؤں سے برابر لڑتے رہے، جیسا کہ آیندہ کی تفصیلات سے معلوم ہوگا، انگریز ہندوؤں کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی ضرور کرتے رہے، مگر ان کو جنم استھان کو مسمار کر کے بابری مسجد کی تعمیر کا کوئی معاصر و مستند ثبوت نہیں ملا، اس لیے مسلمانوں کو بے دخل کرا کے اس کو ہندوؤں کے حوالے نہ کر سکے، گو وہ ہندوؤں کو یہ کہہ کر ورغلاتے رہے کہ یہ مسجد جنم استھان ہی کو توڑ کر بنائی گئی ہے، اس کے لیے اپنے گزیٹر میں تحریریں بھی لکھتے رہے، مگر گزیٹر کی تحریریں مستند اور مؤثر ثابت نہیں ہوتیں، انگریزوں کی حکومت باضابطہ ہوگئی تو ان کے زمانہ میں یا ان کی حوصلہ افزائی سے بیراگی کبھی مسجد میں گھس آتے،

ہاں مورتی بھی رکھ دیتے، پوجا پاٹ بھی کر لیتے، مگر ان کے خلاف عدالتی کارروائی کی جاتی تو وہ شکست کھا جاتے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، انگریزوں کی یہی مصلحت رہی کہ وہ اس جھگڑے میں دونوں کو الجھائے رکھیں تاکہ وہ دونوں کے مذہبی جذبات کا استحصال اپنے سامراجی مقاصد کے لیے کرتے رہیں۔

اب اس تنازعہ کو ذرا مقدمہ کی مثل کے ذریعہ سے ناظرین سمجھیں، پہلے ہم مقدمہ کی مذکورہ نقل کریں گے، پھر ان پر تبصرہ کریں گے، تاکہ صورت حال کی وضاحت ہو،

۱۸۵۸ء کے مقدمہ کی ایک درخواست

نقل درخواست محمد اصغر خطیب و مؤذن مورخہ ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء۔ مجریہ نمبر ۳۳۸۴ محلہ کوٹ رام چندر راجودھیا۔۔۔عرضی۔۔۔۔۔ در دوبارہ کھڑا کرنے نشان در مسجد جنم استھان منعقدہ ۱۵ دسمبر ۱۸۵۸ء۔

غریب پرور سلامت، جناب عالی! سانحہ جدید سرزد ہوا ہے کہ مسمی بیگ سنگھ ۔۔۔۔ ملازم سرکار دولت مدار باعوری بیراگیان جنم استھان کا بانی فساد ہے، بیچ مسجد بابری واقع اودھ قریب محراب و منبر کے ایک چبوترہ مٹی کا بہ بلندی چہار انگشت بنا کی ۔۔۔ مامور کر کے ۔۔۔ آتش کے مصروفیات ہے، چبوترہ مسجد اندر کٹہرہ اوپر چبوترہ کے چبوترہ جدید ۔۔۔ موقوف ہوئی ہے، بہ بلندی تقریباً سوا گز کا تیار کر کے نشان و تصویریت استادہ کیا ہے، و برابر اس کے ایک گڑھا کھود کر منڈیر پختہ کر نداس کی تیار کر کے آتش روشن کی ہے، پوجا ہوم میں مصروف ہیں وجا بجا مسجد میں کوئلے سے رام رام لکھا ہے، عادل رعایا یہ مقام انصاف کا ہے کہ صریح ظلم و زیادتی اہل ہنود اہل اسلام پر کرتے ہیں وحضور پاک فریقین کے بیچ مضمون ۔۔۔۔ سے ہی صاف مترشح ہے کہ مذہب پر کوئی فریق تعرض نہ کرے ۔۔۔۔ مبادرت کرے گا تو سرکار سے سزایاب ہوگا۔

جناب عالی! مقام غور کا ہے، مسجد مقام عبادات مسلمانان ہے کہ بخلاف اس کے کچھ ہنود کی سابق میں قبل بلوہ عملداری سرکار مقام جنم استھان کا صدہا برس سے پریشان پڑا رہتا تھا اہل ہنود پوجا کرتے تھے، چبوترہ بہ سازش بنی غلام تھانہ دار اودھ کے بیراگیوں نے شباشب مین تا صدور حکم سرکار کے واسطے مخالفت کے نافذ ہوا تھا، بہ بلندی ایک بالشت تیار کرا لیا، اس وقت جناب ڈپٹی کمشنر بہادر کے بموجب حکم جناب کمشنر نے تھانہ دار کو موقوف کیا، و بیراگی پر جرمانہ بھی ہوا، اب فی الحال روشن چبوترہ کو ہی تخمیناً سوا گز تیار کرا لیا ہے، اس صورت صریح زیادتی ثابت ہے، لہٰذا امیدوار ہوں کہ بنام مرتضیٰ خان کوتوال شہر صدور حکم ہووے کہ کوتوال بچشم خود معاینہ کر کے امورات جدید کھدوا ڈالیں و مردمان ہنود کو بیرون مسجد کے کریں واجب جان کر عرض کیا، بندہ محمد خطیب و موذن مسجد بابری واقع اودھ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء

(نوٹ) اصل کاغذ جا بجا پھٹ گیا ہے۔

تبصرہ | اس درخواست میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ بیراگیوں میں سے ایک نے مسجد کے اندر محراب و منبر کے پاس مٹی کا ایک چبوترہ بنا لیا ہے، اس کے برابر ایک گڈھا کھود کر پختہ منڈیر بھی تعمیر کر لی ہے، اور اس پر آگ روشن کر کے پوجا اور ہوم کیا جاتا ہے، مسجد میں کوئلہ سے رام رام لکھ دیا گیا ہے، اس کی دادرسی طلب کی جاتی ہے، پھر اسی درخواست میں یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ مسجد کے متصل جنم استھان سیکڑوں برس سے خالی پڑا تھا، اور وہیں آ کر ہندو پوجا کرتے تھے، لیکن بیراگیوں نے تھانیدار کی سازش سے وہاں پر ایک چبوترہ بنا لیا تھا، ڈپٹی کمشنر نے اس سلسلہ میں تھانیدار کو موقوف کیا، اور بیراگیوں پر جرمانہ کیا، مگر چبوترہ توڑا نہیں گیا، بلکہ ایسا ہی رہنے دیا گیا، جس کے بعد اس کو بیراگیوں نے اور بڑھا لیا، اس سے ظاہر ہے کہ جنم استھان کی جائے وقوع مسجد سے باہر تھی جہاں مسجد بنی ہے وہ جگہ نہ تھی، اس مقدمہ میں جو فیصلہ ہوا وہ تو نہ مل سکا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے اندر جو چبوترہ

بنایا گیا تھا وہ عدالت کے حکم سے منہدم کرا دیا گیا، کیونکہ آگے سن ۱۸۶۰ء میں بحوالہ درخواست خطیب اور موذن کی طرف سے دی گئی اس میں مسجد کے اندر چبوترہ کا ذکر نہیں۔

مسجد کا رجسٹریشن سن ۱۸۶۰ء | اس جھگڑے کی وجہ سے احتیاطاً سن ۱۸۶۰ء میں یہ مسجد باضابطہ رجسٹرڈ کرالی گئی، اور سن ۱۸۶۰ء کے شل بند رجسٹرار کے یہاں یہ بابری مسجد کی حیثیت سے درج ہے۔

اس کے بعد سن ۱۸۶۰ء میں میر رجب علی خطیب بابری مسجد کی طرف سے نومبر سن ۱۸۶۰ء میں ایک درخواست پڑی جس کی نقل ذیل میں درج ہے:

۱۸۶۰ء کے مقدمہ کی ایک درخواست | نقل درخواست میر رجب علی خطیب مسجد بابری مورخہ یکم نومبر ۱۸۶۰ء ... نمبر ۱۱۵ محلہ کوٹ رام چندر اجودھیا۔ میر رجب علی بنام اقبال سنگھ

مورخہ ۹ مارچ سن ۱۸۶۱ء، میر رجب علی مسجد بابری ساکن اودھ۔

غریب پرور سلامت! عرضی ہذا جو چبوترہ نیا قریب مسجد بابری اقبال سنگھ ..... کے بعد ملاحظہ مضمون ......

واقع اودھ مدعیٰ علیہ نے بنایا ہے، بعد تحقیقات منہدم فرمایا جائے نیز مچلکہ مدعیٰ علیہ سے عدم مزاحمت واسطے دادرسی ... حلف لے لیا جائے، فقط مدعی ..... مدعا علیہ کا، مگر پاس حضور میں گذارش کروں کہ عرصہ قریب بیس روز کے ہوئے مدعیٰ علیہ نے ایک چبوترہ از راہِ زبردستی و خلاف عمل درآمد ... ملحقہ مسجد بابری میں پاس قبر قاضی قدوہ مرحوم کے بنالیا ہے، ... ہر روز چبوترہ بڑھاتا جاتا ہے، حالانکہ اس کو منع کیا جاتا ہے، مگر کسی طرح باز نہیں آتا، بلکہ آمادہ ہنگامہ و تکرار رہتا ہے، فدوی بخوف سرکار طرح دیتا ہے، سابقاً عرصہ قریب ڈیڑھ برس کے ہوا ہوگا کہ بیراگی داس بنت ہنومان گڑھی نے زبردستی مکان بنانا چاہا تھا کہ وہ مقدمہ دائر عدالت ہوکر ڈگری بحق ہم مدعی صادر ہوئی، و فیصلہ ضلع تا محکمہ عالیہ کمشنری بحال رہا، بلکہ مچلکہ عدم مزاحمت بیراگی داس مذکور

سے کیا گیا، کہ وہ مثل سررشتہ میں موجود ہے، وبعدہ ڈپٹی کمشنر جناب . . . فورڈ صاحب بہادر

مدعیٰ علیہ مذکور نے جھنڈا واسطے برپا ہونے نزاع کے قریب مسجد کے یعنی صحن میں نشست کیا تھا،

کہ جناب صاحب محتشم بعد ملاحظہ جھنڈا نصب ساختہ مدعیٰ علیہ اکھڑوا ڈالا، نیز فہمایش فرمایا تھا، لیکن

. . . . مدعیٰ علیہ از راہ عدول حکمی سرکار مرتکب امر ہوا ہے، اور ورثائے قبرستان . . . بہت پریشان

ہیں، علاوہ اس کے جب موذن مسجد میں اذان دیتا ہے تو وہ ناقوس یعنی سنکھ بجاتا ہے، تو عالی جناب!

ایسا کبھی نہیں ہوا، اور سرکار حاکم دونوں فریق کے ہیں، لہٰذا درخواست ہٰذا حضور میں گذار کر امیدوار

ہوں کہ مدعیٰ علیہ کو حکمت بیجا سے باز رکھا جائے، بعد تحقیقات چبوترہ جدید تعمیر ساختہ مدعیٰ علیہ کہ جو

کبھی وہاں نہ تھا، نیا بنایا ہے، منہدم فرمایا جاوے، ونیز مقدمہ مچلکہ سے عدم مزاحمت دی جائے'

سنکھ وقت اذان مدعیٰ علیہ سے لے لیا جائے، تا ہم غریب مدعیٰ علیہ سے نجات پائیں، واجب

جان کر عرض کیا، میر رجب علی خطیب مسجد بابری واقع اودھ ساکن اودھ۔

مورخہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء

تبصرہ | اس درخواست سے ظاہر ہے کہ اقبال سنگھ مدعا علیہ نے مسجد سے ملحق ایک چبوترہ بنالیا ہے'

اور اس کو بڑھاتا جاتا ہے، اس کو عدالت سے روکے جانے کی درخواست کی گئی ہے، پھر اس میں

یہ بھی ہے کہ ہنومان گڑھی کا بنت ہری داس مسجد کے پاس ایک مکان بنانا چاہتا تھا، گر سرکاری

حکم سے اس کو روکا گیا، اس درخواست میں یہ بھی ہے کہ مسجد کے اندر ایک جھنڈا لہرایا گیا، لیکن

سرکاری حکم سے یہ اکھڑوا دیا گیا، اس سے ظاہر ہے کہ مسجد کو مسلمانوں کی مسجد تسلیم کر کے یہ جھنڈا وہاں

سے اکھڑوایا گیا، اس درخواست میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب مسجد میں موذن اذان دیتا ہے تو اس

وقت سنکھ بجایا جاتا ہے، جو پہلے کبھی نہیں بجایا جاتا تھا، درخواست میں التجا کی گئی ہے کہ چبوترہ وہاں

نہ بننے دیا جائے، اور اذان کے وقت سنکھ بجانے سے روک دیا جائے، اس کے بعد معاملہ کی تفتیش

کرائی گئی، اس کی رپورٹ کی نقل حسب ذیل ہے:

سن۱۸۶۰ء کے مقدمہ کی ایک رپورٹ

نقل رپورٹ مورخہ ۱۹ر دسمبر سن۱۸۶۰ء مقدمہ مثل نمبری ۱۱۵
موقع محلہ کوٹ رام چندر اجودھیا میر رجب علی بنام اقبال سنگھ مفصلہ

۱۸ر مارچ سن۱۸۶۱ء

تعمیل حکم ہذا کریں کہ مسکن اقبال سنگھ مدعیٰ علیہ پر جاکر معاینہ کیا تو ایک کٹیا کہ جس میں مدعیٰ علیہ رہتا ہے، بنی ہوئی ہے، اور آج کل کوئی جدید چبوترہ اس نے نہیں بنایا، اور اقبال سنگھ مذکور کو فہمایش کر دی گئی کہ اب تاصدور حکم ثانی جناب اسسٹنٹ کمشنر بہادر، اب بنیاد جدید نہ ڈالیں، نہ چبوترہ بڑھائیں، اور چوکی داران محلہ کو تاکید کر دی ہے کہ اگر اب آیندہ یہ مدعیٰ علیہ چبوترہ وغیرہ جدید بناوے تو تھانے پر اطلاع کر کے بحضور بندگان ... گذارش کیا جاوے اور وہ کٹیا جس میں مدعا علیہ رہتا ہے چار مہینہ کی بنی ہوئی ہے، اور مضمون پروانہ کا یہ ہے کہ اگر مدعیٰ علیہ ہر روز بڑھاتا ہو یا اور بنیاد جدید چبوترہ پر ڈالے ہو تو بنانے سے باز رکھ کر اٹھا دیوے، صاف کر دیوے۔

مدعا علیہ اب اگر جدید چبوترہ کی بنیاد ڈالے اور بڑھاوے تب مدعا علیہ کو اٹھا دیوے یا جیسے کہ مدعا علیہ اپنی کٹیا میں جو چار مہینہ کی بنی ہوئی ہے، اور رہتا ہے اس میں سے اٹھا دیں، جیسا ارشاد ہو، اس موافق تعمیل ہو، رپورٹ ہذا ارسال حضور ہے۔ مورخہ ۱۹ر دسمبر سن۱۸۶۰ء

سن۱۸۶۱ء کے ایک حکم نامہ کا نقل

نقل امور احکام ۷ سن۱۸۶۱ء
۱۵ر مارچ سن۱۸۶۰ء

آج پیش ہو کر حکم ہوا کہ تھانیدار کو لکھا جائے کہ پہلے دریافت کریں کہ جو کٹیا چار مہینہ سے مدعا علیہ نے بنایا ہے وہ اجازت سرکار سے حاصل کر کے بنایا ہے یا نہیں، اور اگر کوئی

اجازت سے نہیں بنائی گئی تو کٹیا اٹھوادیں۔ المرقوم ۷ر فروری ۱۸۵۹ء

تبصرہ | تفتیش کے بعد یہ رپورٹ دی گئی کہ مدعیٰ علیہ نے کوئی نیا چبوترہ نہیں بنایا ہے، اور نہ اسمیں اضافہ کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چبوترہ پہلے بنایا گیا تھا، وہی برقرار ہے، اس کو کہہ دیا گیا ہے کہ سرکاری حکم کے بغیر کوئی اضافہ کیا گیا تو اس کو وہاں سے ہٹادیا جائے گا، محلہ کے چوکیداروں کو بھی سکی تاکید کی گئی کہ یہ کٹیا جو چار مہینوں کی بنی ہوئی ہے اس کے لیے حکم کیا گیا کہ اس میں اضافہ نہ ہونے پائے، اور اگر اس میں اضافہ کیا جائے تو مدعیٰ علیہ کو ہٹادیا جائے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابری مسجد کو مسجد تسلیم کرکے یہ حکم جاری کیا گیا، کیونکہ چبوترہ اور کٹیا سے جھگڑا پیدا ہونے کا احتمال تھا، پھر ایک جھگڑا مسجد کی دیوار اور پھاٹک کے لیے ہوا، اس سلسلہ میں حسب ذیل درخواست کورٹ میں دی گئی،

۱۸۶۰ء ۱۸۷۰ء کے مقدمہ کی ایک درخواست | نقل درخواست محمد اصغر ۱۸۷۰ء رگھوبیر منعقدہ ۲۲ر جنوری ۱۸۸۵ء
محمد اصغر خطیب و موذن مسجد بابری واقع جنم استھان اودھ۔

درجواب صدور حکم جائے دروازہ متعلق سائل ۔۔۔۔ تیار کیا ہے تو اس کا ۔۔۔۔ سائل ۔۔۔۔ نامنظوری دید یاجائے ۔۔۔۔۔۔ دروازہ سے متعلق نہیں ہے۔

عادل زمان، غریب پرور سلامت ۔۔۔۔۔ مسجد بابری واقع جنم استھان اودھ میں حکم ۔۔۔۔ دروازہ جدید جانب اتر ۔۔۔۔۔ تیار ہورہا ہے ۔۔۔۔۔ دیوار اس کی شکست کروادی گئی ہے، اب بنظر چالاکی کے ۔۔۔۔۔ دکھن منہ چبوترہ واسطے قائم کرنے ملکیت اسی دیوار مسجد کی طرح تیار کی پاس ہے ۔۔۔۔۔ منصب خاندانی سائل ۔۔۔۔ خلاف عمل درآمد قائم ہوئی ہے، کیونکہ لکھیم داس مہنت و دیگر مہنتان ماسبق کو سوائے چبوترہ کے دوسرے میں مداخلت نہیں ہے، دیوار احاطہ مسجد کی ہے، کچھ چبوترہ کی نہیں ہے، اس میں اکثر احکام عدالت ہیں کہ کوئی امر جدید نہ ہونے پائے۔ اس صورت میں مدعیٰ علیہ کو حکم ہوئے کہ وہ کنارہ کش دروازہ کے ہو دیئے و سائل کو

اجازت موجود ہووے کہ دروازہ وکنجی دروازہ پاس سائل کے رہے کہ وقت کثرت میلہ آمد و رفت دروازہ کھول دیا کریں، اگر ضرورت جانیں تو سائل سے کھلوایا جائے ورنہ ۔۔۔۔ سے دیا جائے، تاکہ باعث رفع تکرار کا ہو جائے، لیکن کنجی متعلق سائل سے رہے، بہت سے ضروری واجب جان کر عرض کیا،

فدوی سید محمد اصغر خطیب و متولی مسجد بابری واقع اودھ مورخہ ۲ر اپریل ۱۸۷۷ء

تبصرہ | اس درخواست سے معلوم ہوتا ہے کہ مہنتوں نے کوشش کی کہ مسجد کی ایک دیوار کو توڑ کر اپنی ایک دیوار بنا لیں، اور اس میں ایک دروازہ لگا دیں، کیونکہ میلے کے موقع پر پورب سے آنے جانے میں مزاحمت کا اندیشہ ہے، اس لیے مسجد کے اتر طرف ایک دروازہ بنا لیں، اس کے بنانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ چبوترہ مہنتوں کی ملکیت میں آجائے، مسجد کے خطیب اور موذن کی طرف سے یہ درخواست پڑی کہ یہ دیوار مسجد کی ہے، مہنتوں کا اس پر کوئی حق نہیں، انھوں نے اس کی پیش کش کی کہ دروازہ مسجد کا ہو اور اس کی کنجی مسجد کے خطیب کے پاس رہے، میلہ کے موقع پر وہ دروازہ کھول دیا کرے گا، تاکہ کوئی تکرار نہ ہو، اس پر جو حکم نامہ صادر ہوا وہ نہیں مل سکا، یہ درخواست بہ ظاہر ۱۸۸۰ء کی معلوم ہوتی ہے۔

پی۔ کارنیگی کی رپورٹ ۱۸۷۰ء | اس مقدمہ بازی کے درمیان انگریزوں کی سامراجی حکومت قائم ہو کر مضبوط ہو چکی تھی، ان کو اب موقع تھا کہ ہندو مسلمان میں باہمی نفرت پیدا کرنے کے سلسلہ میں ہر قسم کی تدبیریں اختیار کریں، انھوں نے اجودھیا میں مسجد اور مندر کا جھگڑا کھڑا کر کے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے دور کر ہی دیا تھا، اب بابری مسجد اور جنم استھان کا قضیہ جاری تھا، اس کو اور ہوا دینا تھا، جنم استھان کو مسمار کرنے کا کوئی تاریخی ثبوت ہندو اور نہ انگریز پیش کر سکے تھے، انگریزوں کو تحریری ثبوت پیش کرنے کی فکر ہوئی، ۱۸۷۰ء میں

فیض آباد تحصیل کا بندوبست ہونے لگا تو اس کے سٹلمنٹ افسر اور قائم مقام ڈپٹی کمشنر پی۔ کارنیگی نے ایک رپورٹ پیش کی، جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

"مقامی طور سے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حملے کے وقت یہاں تین اہم مندر تھے، جن میں تھوڑے سے پجاری رہتے تھے، اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا، تینوں مندر یہ تھے، جنم استھان، سورگ دوار مندر (جو رام دربار بھی کہلاتا تھا) اور ترییتا کا ٹھاکر جنم استھان وہ جگہ ہے، جہاں رام چندر پیدا ہوئے، سورگ دوار وہ پھاٹک ہے جس سے وہ بیکنٹھ میں گئے، ممکن ہے کہ یہ وہ جگہ ہو جہاں وہ جلائے گئے، ترییتا کا ٹھاکر وہ مقام ہے جہاں رام چندر نے بھینٹ چڑھائی تھی، اس کی یاد میں یہاں اپنی تین مورتیاں اور سیتا کی ایک مورتی رکھوائیں، بابر کی تزک کے لیڈن کے نسخہ کے مطابق یہ شہنشاہ سرجو اور گھاگھرا کے سنگم پر جو اجودھیا سے دو یا تین کوس پر ہے، ۲۸ مارچ ۱۵۲۸ء میں قیام پذیر ہوا، وہ یہاں ایک شکارگاہ کا ذکر کرتا ہے، جو اودھ سے سات آٹھ کوس پر سرجو کے ساحل پر تھی، یہ بات قابل توجہ ہے کہ بابر کی تزک کے جتنے نسخے ہیں ان میں اجودھیا میں بابر کے آنے کا ذکر نہیں، اس کے وہ اوراق مفقود ہیں، بابری مسجد میں دو جگہوں پر وہ تاریخ لکھی ہے، جب یہ بنائی گئی، یہ ۹۲۵ھ مطابق ۱۵۲۸ء ہے، یہ پتھر پر کھدی ہوئی ہے، اس کے کتبے میں بابر کی شان و شوکت کا ذکر ہے، جنم استھان ہنومان گڑھی سے چند سو قدم کے فاصلہ پر ہے، ۱۸۵۵ء میں ہندو مسلمان دونوں میں سخت جھگڑا ہوا، ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کر لیا، لیکن مسلمانوں نے جنم استھان پر تسلط کر لیا، مسلمان ہنومان گڑھی کے زینہ تک ضرور پہنچے، مگر وہ کافی نقصان کے ساتھ پیچھے ڈھکیل دیے گئے، ہندوؤں نے کامیابی کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، تیسری بار جنم استھان پر قبضہ کر لیا، جس کے پھاٹک پر ۷۵ مسلمان مارے گئے، اور وہ گنج شہید ان میں دفن کیے گئے، بادشاہ کے کئی فوجی

رسے اس سانحہ کو حسرت دیکھتے رہے، ان کو حکم تھا کہ مداخلت نہ کریں، یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد مندر میں عبادت اور پوجا کرتے رہتے تھے برطانوی حکومت کے زمانہ سے بیچ میں سلاخیں ڈال دی گئیں، تاکہ جھگڑا نہ ہو، مسجد میں مسلمان نماز پڑھیں سلاخوں سے باہر ہندو اس چبوترہ پر پوجا کریں جو انھوں نے تعمیر کیا ہے" (ترجمہ از اقتباس انگریزی، شایع کردہ مسلم انڈیا انگریزی، مارچ سنہ ۱۹۸۶ء ص ۱۱۹)

تبصرہ | اس اقتباس کا تجزیہ ذرا احتیاط سے کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ آیندہ یہی باتیں فیض آباد کے نئے گزیٹیروں میں دہرائی گئیں، شروع میں یہ کہا گیا ہے کہ

"مقامی طور سے یقین دلایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حملے کے وقت یہاں تین اہم مندر تھے جن میں تھوڑے سے پجاری رہتے تھے، اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا"

یہ باتیں زبانی روایتوں کے سہارے لکھی گئی ہیں، ایک مورخ کے سامنے زبانی روایتوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی، اگر ایسی روایتیں مانی جا سکتی ہیں تو رد بھی کی جا سکتی ہیں، ان کا مستند ہونا یقینی نہیں، پھر یہ کہا گیا ہے کہ وہاں تھوڑے سے پجاری رہتے تھے، اس لیے کہ اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا، اس بیان سے ظاہر ہے کہ اجودھیا کے پوتر ہونے کی حیثیت ختم ہو چکی تھی اس لیے یہ ویران ہو گیا تھا اور مندروں میں تھوڑے سے پجاری رہتے تھے، اس ویران مقام میں ایک مسجد بن گئی، تو کون سا جرم سرزد ہوا، اس کے بعد جنم استھان، سورگ دوار اور تریتا کا ٹھاکر کا ذکر ہے، جن کے وجود کو بھی زبانی روایتوں سے یقین دلانے کی کوشش کی گئی، پھر اودھ میں بابر کے آنے کا ذکر ہے، لیکن یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بابر کی تزک میں اجودھیا آنے کا ذکر نہیں، اور جب وہ یہاں نہیں آیا تو ظاہر ہے کہ یہی سمجھا جائے گا کہ اس نے جنم استھان کے مندر کو نہ مسمار کیا، اور نہ اس کی جگہ پر مسجد بنوائی، لیکن اس بات کو مبہم یہ لکھ کر بنا دیا گیا ہے کہ تزک کے ایسے اوراق

مفقود ہیں جن میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر رہا ہو، ایسے قیاسات ایک مورخ کے لیے قابل قبول نہیں، یہ صرف فتنہ کو تقویت پہونچانے کے لیے لکھا گیا ہے، اوپر کے اقتباسات میں رام جنم استھان کے مسمار کیے جانے کا ذکر نہیں، مگر اشارہ وکنایہ میں یہ بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے، یقین کے ساتھ یہ بات کہی بھی نہیں جا سکتی تھی، کیونکہ اس کا کوئی مستند ثبوت نہیں، اور جب یہ لکھا گیا ہے کہ یہ مسجد اس کے کتبہ کے مطابق ۱۵۲۸ء میں بنی اور اس کے کتبہ میں بابر کا ذکر ہے تو اس کو تسلیم کرنے میں کیا شک وشبہہ تھا کہ یہ بابر کے زمانہ میں بنائی گئی، اگر یہ تسلیم کر لیا جاتا تو پھر اس کا قضیہ آگے کیسے بڑھتا، پھر یہ لکھا گیا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں ہندو مسلمان دونوں میں سخت جھگڑا ہوا، مگر اس جھگڑے کے اسباب کی تصریح نہیں کی گئی ہے، پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھگڑا بابری مسجد کی خاطر ہوا، لیکن ہم گذشتہ اوراق میں یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ یہ جھگڑا اس مسجد کے لیے ہوا جس کو ہنومان گڑھی میں ہندوؤں نے مسمار کر دیا تھا، اس جھگڑے کی تفصیل بیان کرنے میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ پہلے ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کر لیا، یہاں تک تو ٹھیک ہے، مگر اس میں جب یہ لکھا گیا ہے کہ مسلمانوں نے جنم استھان پر تسلط کر لیا، تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنم استھان موجود تھا، مسمار نہیں کیا گیا، اسی پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا، مگر جنم استھان سے یہاں پر بابری مسجد مراد ہے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ اسی کے پھاٹک پر پچھتر مسلمان لڑتے ہوئے شہید ہوئے، اب سوال یہ ہے کہ اس میں بابری مسجد کے بجائے جنم استھان کیوں لکھا گیا؟ محض اس لیے کہ ہندوؤں کو یہ یقین دلایا جائے کہ بابری مسجد دراصل جنم استھان ہے، اس کو صرف فتنہ انگیزی ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے، اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ بادشاہ یعنی واجد علی شاہ کے فوجی دستے اس سانحہ کو صرف دیکھتے رہے، ان کو حکم تھا کہ وہ مداخلت نہ کریں، یہ جھوٹ صرف کمانڈر بارلو کی سفاکانہ گولہ اندازی پر پردہ ڈالنے کے لیے

گذشتہ اوراق میں اس کی تفصیل آچکی ہے، اور پھر یہ بات تو سراسر افترا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد مندر میں عبادت اور پوجا کرتے رہے تھے، کوئی مسلمان یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جس عبادت گاہ میں مورتی کی پوجا ہو وہاں نمازیں بھی پڑھی جائیں، یہ بات بھی فتنہ کو ہوا دینے کے لیے کہی گئی ہے، اور جب روایت چلی آرہی تھی، تو برطانوی حکومت کے زمانہ میں بیچ میں سلاخیں کیوں ڈال دی گئیں کہ مسجد میں مسلمان نماز پڑھیں اور اس کے باہر ہندو چبوترہ پر پوجا کریں، اور جھگڑا نہ ہو، اور ہندوؤں نے بھی یہ تسلیم کر لیا کہ بابری مسجد مسجد ہی ہے، جہاں صرف نماز پڑھی جا سکتی ہے، پوجا نہیں ہو سکتی، پوجا اس کے باہر ہو، یہ بات بھی صحیح نہیں کہ مسجد اور چبوترہ کے بیچ میں برطانوی حکومت کے زمانہ میں سلاخیں ڈالی گئیں، قیصر التواریخ کے مصنف کا بیان ہے کہ نواب واجد علی شاہ نے پہلی بار مسجد اور چبوترہ کے درمیان جنگلہ دے کر دونوں کی تقسیم کر دی، اس کو ۱۸۵۵ء میں بیراگیوں نے توڑ دیا، (ج ۲، ص ۱۱۲) یہ اور بات ہے کہ پھر بعد میں سلاخیں ڈال دی گئی ہوں،

الگزنڈر کننگھم کی رپورٹ جلد اول ۱۸۶۲ء

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی سامراجیت پورے طور پر قائم ہو گئی تو انھوں نے جہاں اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کی خاطر اور بہت سے کام کیے، وہاں آثار قدیمہ کا محکمہ قائم کر کے ان پر کتابیں لکھوانی شروع کیں، اور ہر ضلع کے گزیٹر بھی لکھوائے، بظاہر یہ بہت ہی مفید کام دکھائی دیا، مگر ان میں جو زہر بھرا گیا، ان سے لوگ بے خبر رہے، الگزنڈر کننگھم ہندوستان کے آثار قدیمہ کا بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، اسکی رپورٹیں آج تک تاریخی اور تحقیقی کاموں کے لیے ناگزیر ہیں، اس نے ۱۸۶۲ء میں اپنی رپورٹ کی جلد اول میں اجودھیا پر جو باب لکھا ہے، اس سے بہتر آج تک اس شہر پر کوئی اور مورخ و محقق نہیں لکھ سکا، ہم یہاں پر اس کے کچھ اقتباسات جستہ جستہ پیش کرتے ہیں:

"یہاں پر میں ذکر کردوں کہ میں نے ایک دوسری جگہ کے بارے میں سنا ہے جو ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ہے، یہ گومتی کے کنارے ہے، اور ست بارہ یا سیوتا وراہا (سفید سور) کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ پندرہ کلومیٹر یا تین میل سلطان پور سے لکھنؤ کی جانب ہے، یہاں دو سالانہ میلے لگتے ہیں، پہلا نومیں چیتر کو لگتا ہے، جب چاند بڑھتا جاتا ہے، دوسرا کاتک کی پندرہویں تاریخ کو لگتا ہے، جب چاند مکمل ہوجاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہاں پچاس ہزار آدمی جمع ہوکر اشنان کرتے ہیں، پہلا میلہ رام نومی تیرتھ کہلاتا ہے، میں ست بارہ کے نام کی اصلیت کا پتہ نہ چلا سکا۔"

اس کا ایک اقتباس یہ بھی ہے کہ بودھائیں گوتم بدھ نے یہاں دو جگہوں پر قیام کیا ہر دو میں وہ ۹ یا ۱۹ برس رہے۔

چینی سیاح ہیون سانگ کا بیان ہے کہ وہ وساکا میں چھ سال رہے، یہ سرسوتی کے جنوب میں کچھ فاصلہ پر تھا، میرے خیال میں وساکا اور ساکت دونوں ایک ہی جگہیں ہیں، اس کے بعد کننگھم اجودھیا کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

"اجودھیا کا موجودہ شہر پرانے شہر کے اتر پورب میں واقع ہے، لمبائی میں دو میل ہے اور پون میل چوڑا ہے، لیکن اس شہر کا آدھا حصہ بھی عمارتوں سے آباد نہیں ہے، پورے شہر پر زوال کے آثار ہیں، کھنڈروں کے اونچے اونچے ٹیلے بھی نہیں ہیں، وہاں ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بھی نہیں ملتی ہیں، منقش ستون بھی نہیں پائے جاتے ہیں، جیسا کہ دوسرے شہروں کے ویرانوں میں پائے جاتے ہیں، کوڑے کرکٹ کے تودے ضرور ہیں جن سے اینٹیں نکال کر پڑوسی شہر فیض آباد کے مکانات بنائے گئے ہیں، یہ مسلمانوں کا شہر ڈھائی میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے، یہ شہر ان ٹیلوں سے بنا ہے جو اجودھیا میں کھود کر نکالے گئے ہیں، دونوں شہر چھ مربع میل میں واقع ہیں، یہ گویا رام کی قدیم راجدھانی اجودھیا کا نصف ہے، فیض آباد میں صرف بہو بیگم کا مقبرہ نمایاں طور سے دکھائی دیتا ہے، اس بیگم کا ذکر والنٹنگز کے

مقدر کے سلسلہ میں آیا، فیض آباد وہاں کے ابتدائی نوابوں کا دارالسلطنت تھا، لیکن آصف الدولہ کے زمانہ میں یہ ویران ہو گیا۔"

آگے چل کر گنگم لکھتا ہے:

"راماین کے بیان کے مطابق اجودھیا کو "منو" نے آباد کیا، "منو" انسان کے ابوالآبا سمجھے جاتے ہیں، رام چندر کے پتا دسرتھ کے زمانہ میں اس میں قلعہ بند شہر تھے، پھاٹک بھی تھے، اور اس کے چاروں طرف خندقیں تھیں، لیکن ان کا نام و نشان بھی اب دکھائی نہیں دیتا، اس کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں، کہا جاتا ہے کہ رام کا اجودھیا وری ادبالا کی موت کے بعد ایک بڑی لڑائی میں ۱۴۲۶ ق م میں برباد ہو گیا، اس وقت سے یہ وکرماجیت کے زمانہ تک ویران رہا، مشہور روایت یہ ہے کہ وکرماجیت اجین کا مشہور شکاری راجہ تھا، موجودہ دور کے ہندو وکرما کے سارے اعمال اسی سے منسوب کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کی یہ رائے صحیح ہے، ہیون سانگ کا بیان ہے کہ اس نام کا ایک طاقت ور راجہ سرسوتی کے پڑوس میں کنشک سے ایک سو سال بعد کا تھا، اور تقریباً ۷۸ ق م کا زمانہ تھا، اور یہی سالی واہانہ کے شروع سا کا سنگ کا زمانہ تھا، اس بکرماجیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بودھ مذہب کے پیرووں کا دشمن تھا، وہ بڑا سرگرم برہمن تھا، میری رائے ہے کہ اسی نے اجودھیا کی ازسرنو تعمیر کی، اور رام چندر کی تاریخ میں جو مقدس جگہ ان کے نام سے موسوم تھی ان کو تلاش کرایا، روایۃً یہ بات کہی جاتی ہے کہ جب وہ اجودھیا آیا تو یہ بالکل کھنڈر تھا، اور جنگلوں سے بھرا تھا، اس نے رام چندر کی مشہور جگہ کی کھوج لگائی، سرجو ندی کے گھاٹ سے اس نے پیمائش شروع کی، بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین سو ساٹھ ۳۶۰ مندر، رام چندر، ان کی بیوی سیتا، لکشمن اور شتروگھن ہنومان اور دوسرے ناموں پر بنوائے، تین سو ساٹھ ۳۶۰ کی تعداد کا تعلق سالی واہانہ سے بھی ہے، کیونکہ راجہ کے قبیلہ کے دیسی راجپوت کہتے ہیں کہ راجہ کی تین سو ساٹھ ۳۶۰ بیویاں تھیں یعنی ہر بیوی کی خاطر اس نے ایک مندر بنوایا۔"

کچھ آگے چل کر کننگھم رقمطراز ہے:

"اجودھیا میں بہت سے برہمنوں کے مندر ہیں، لیکن وہ جدید زمانہ کے ہیں، ان میں اثری خوبیاں نہیں ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ مندر زیادہ تر ان مندروں کی پرانی جگہوں پر بنائے گئے ہیں جن کو مسلمانوں نے مسمار کر دیا تھا۔ رام کوٹ کا ہنومان گڑھی شہر کے پورب جانب ہے، یہ چھوٹا سا قلعہ ہے، جو دیواروں سے گھرا ہے، یہ ایک جدید مندر کو گھیرے ہوئے ہے جو ایک ٹیلہ کے اوپر ہے، رام کوٹ یقیناً بہت پرانا ہے، اس کا تعلق مٹی پربت سے ہے، ہنومان کا مندر زیادہ پرانا نہیں ہے اورنگ زیب کے عہد سے پہلے کا نہیں، شہر کے پوربی کونے میں رام گھاٹ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رام چندر نے اشنان کیا، سرگ دواری یا سورگ دوار سورگ کا پھاٹک ہے، اتر پورب میں اس جگہ کا تعین کیا جاتا ہے جہاں رام چندر جلائے گئے، کچھ سال پہلے یہاں برگد کا درخت تھا، جو اشوک بٹ کہلاتا تھا یعنی یہ وہ برگد ہے جس کے پاس غم نہیں پھٹکتا، شاید یہ نام سورگ وغیرہ کے تعلق سے رکھا گیا ہو، جس کے بارہ میں لوگوں کا یقین ہے کہ جو لوگ یہاں آکر مر جاتے ہیں یا جلائے جاتے ہیں وہ دوسرے جنم سے آزاد ہو جاتے ہیں، اسی کے پاس لکشمن گھاٹ ہے، جہاں رام چندر کے بھائی لکشمن نے اشنان کیا تھا، اور یہاں سے ½ میل کے فاصلہ پر شہر کے قلب میں جنم استھان کا مندر کھڑا ہے، جہاں رام چندر پیدا ہوئے، پچھم کی طرف پانچ میل کی دوری پر گپتار گھاٹ ہے، یہاں کئی سفید مندر ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہیں سے لکشمن غائب ہو گئے تھے، اس لیے اس کا نام گپتار ہے، جس کے معنی چھپا ہوا، ڈھکا ہوا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے لکشمن نہیں بلکہ رام غائب ہوئے، لیکن سورگ دوارے ہیں ان کے جلائے جانے کے قصہ سے اس کی تطبیق نہیں ہوتی۔"

کننگھم یہ بھی لکھتا ہے کہ

"پرانے شہر میں بودھ مت کے بیس مندر تھے، وہاں تین ہزار بھکشو رہتے تھے، اسی کے ساتھ برہمنوں کے پچاس مندر تھے، اور برہمنوں کی آبادی بھی بہت تھی، اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ساتویں صدی کے آغاز میں وکرما دتیا کے بنائے ہوئے تین سو مندر ختم ہو چکے تھے، اور اجودھیا تباہ ہو رہا تھا"

کننگھم کے بیان پر تبصرہ | انگریز مؤرخ کننگھم کی مذکورۂ بالا تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجودھیا ۴۲۶ ق م کے بعد بالکل تباہ ہو گیا، جنگلوں میں کھو گیا اور اس کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی، سارے آثار ختم ہو گئے تھے، لیکن تقریباً ڈیڑھ ہزار برس بعد اس کو محض اندازے سے آباد کیا گیا، اور وہاں تین سو ساٹھ (۳۶۰) مندر بنائے گئے، ان میں سے تین سو (۳۰۰) مندر مسلمانوں کی آمد سے پہلے ختم ہو گئے تھے، اور جب کننگھم نے ۱۸۷۱ء میں اپنی کتاب لکھی تو اجودھیا کا یہ حال لکھا کہ "اس شہر کا آدھا حصہ بھی عمارتوں سے آباد نہیں ہے، پورے شہر پر زوال کے آثار ہیں، کھنڈروں کے اونچے اونچے ٹیلے بھی نہیں ہیں، وہاں ٹوٹی پھوٹی مورتیاں بھی نہیں ملتیں، منقش ستون بھی نہیں پائے جاتے، جیسا کہ دوسرے شہروں کے ویرانوں میں پائے جاتے ہیں"

یہ لکھ کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اس کے عہد تک ہندوؤں کی نظر میں اجودھیا کے تقدس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، پھر وہ یہ لکھ کر بھی بودھوں کو ہندومت سے برانگیختہ کرتا ہے کہ وکرماجیت نے محض بودھوں کو وہاں سے ختم کرنے کے لیے اس شہر کو آباد کیا، پھر یکایک وہ مسلمانوں پر یہ الزام بھی رکھ دیتا ہے کہ اجودھیا میں جو جدید قسم کے مندر بنائے گئے ہیں وہ زیادہ تر ان مندروں کی پرانی جگہوں پر بنائے گئے ہیں جو مسلمانوں نے ویران کر دیے تھے، اس کے لیے کسی تاریخ کا حوالہ نہیں دیتا ہے، مگر اس کا ذکر تو مطلق نہیں کرتا کہ رام جنم استھان مندر کو توڑ کر بابر نے مسجد بنوائی جو بابری مسجد کے نام سے مشہور ہے، اور امر تعجب تو یہ ہے کہ وہ یہ لکھتا ہے کہ

لکشمن گھاٹ سے ۱/۴ میل کے فاصلہ پر شہر کے قلب میں جنم استھان کا مندر کھڑا ہے، اگر کیننگھم کے زمانہ میں یہ مندر باقی تھا تو پھر کیسے یقین کیا جائے کہ بابری مسجد اسی کو توڑ کر بنائی گئی، اور ہندو اور مسلمانوں میں جو مقدمہ بازی ہوئی وہ رام جنم استھان مندر کے لیے گویا نہ تھی بلکہ ایک تصفیہ قصداً کھڑا کر دیا گیا تھا، تاکہ دونوں فرقے ایک دوسرے سے الجھتے رہیں، اور جب وہ یہ لکھتا ہے کہ بودھ مت کے وہاں بیس[۲] مندر تھے جہاں تین ہزار بھکشو رہا کرتے تھے، اور اب وہاں بودھوں کے کچھ بھی آثار نہیں، تو یہ الزام بھی رکھ دیتا ہے کہ وہاں سے بودھ مت کا خاتمہ کیا گیا اس طرح بودھوں کو ہندوؤں سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۸۸۱ء کا فیض آباد گزیٹیر کیننگھم کی تحقیقات سے انگریزوں کو بابری مسجد اور جنم استھان کے تصفیہ کو آگے بڑھانے میں زیادہ مدد نہیں ملی، اس لیے ۱۸۸۱ء میں برطانوی حکومت کی نگرانی میں فیض آباد کا جو گزیٹیر لکھا گیا اس میں اس فتنہ کو ہوا پورے طور پر دی گئی، اس گزیٹیر کے اقتباسات یہ ہیں:

> "زبانی طور پر بتایا جاتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے حملہ کے وقت تین اہم مندر تھے، جن میں کچھ پجاری بھی تھے، لیکن اجودھیا اس وقت ویران تھا، یہ تین مندر یہ تھے (۱) رام جنم استھان (۲) سورگ دوار جو رام دربار کے نام سے بھی جانا جاتا ہے (۳) ترتیا کا ٹھاکر، پہلے مندر پر بابر نے مسجد بنائی جس میں تاریخ ۱۵۲۸ء لکھی ہوئی ہے، دوسرے مندر پر اورنگ زیب نے ایک مسجد اور تیسرے پر اسی بادشاہ یا اس کے کسی پیش رو نے ایک مسجد بنائی، مسلمانوں کا یہ جانا بوجھا اصول ہے کہ جب وہ کسی قوم کو مغلوب کرتے ہیں تو اس پر اپنا مذہب نافذ کرتے ہیں، جنم استھان وہ جگہ ہے جہاں رام چندر پیدا ہوئے، اور سورگ دوار وہ جگہ ہے جہاں سے رام چندر بیکنٹھ گئے، ممکن ہے یہ وہ جگہ بھی ہو جہاں وہ جلائے گئے، ترتیا کا ٹھاکر وہ جگہ ہے جہاں رام چندر نے

بڑی بھینٹ چڑھائی، اپنی اور سیتا کی مورتیاں بھی بٹھائیں، لیڈن کی تزک بابری کے مطابق بابر نے ۲۰ مارچ ۱۵۲۸ء کو سرجو اور گھاگھرا کے سنگم پر اپنے لشکر کا پڑاؤ ڈالا جو اجودھیا سے تین چار کوس کے فاصلہ پر تھا، یہاں وہ سات آٹھ دن ٹھہرا، آس پاس کے علاقہ کو قابو میں کرتا رہا، سرجو کے ساحل پر ایک شکار گاہ تھی، جو اودھ سے سات آٹھ کوس کے فاصلہ پر تھی، یہ بات توجہ کے لائق ہے کہ بابر کی تزک کے تمام نسخوں کے وہ صفحے نہیں ہیں جن میں اجودھیا میں رہ کر اس نے جو کچھ کیا اس کا ذکر ہو، بابر کی مسجد ۹۳۵ھ ۱۵۲۸ء میں بنی، اس میں ایک منقش پتھر ہے جس پر ایک کتبہ ہے، اس میں بابر کی شان و شوکت کا اظہار کیا گیا ہے، اگرچہ اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا، مگر وہاں کم ازکم جنم استھان کا عمدہ مندر ضرور رہا ہوگا کیونکہ وہاں اب بھی کچھ ستون ہیں اور اچھی حالت میں ہیں، ان کو مسلمانوں نے بابری مسجد کی تعمیر میں ضرور استعمال کیا، وہاں گہرے کالے رنگ کے پتھر ہیں، جن کو وہاں کے لوگ کسوٹی کہتے ہیں، ان پر طرح طرح کے نقش بنے ہوئے ہیں، لیکن میرے خیال میں یہ بودھوں کے ستون سے زیادہ ملتے جلتے ہیں، اور ان سے مختلف ہیں جن کو میں نے بنارس یا دوسری جگہوں میں دیکھا ہے، وہ سات یا آٹھ فٹ لمبا ہے، نیچے چوکور ہے بیچ اور کیپٹل میں یا تو گول یا ہشت پہل بنا ہوا ہے۔

جنم استھان ہنومان گڑھی سے کئی سو قدم کے فاصلہ پر ہے، ۱۸۵۵ء میں ہندو مسلمان دونوں کے درمیان ایک سخت جھگڑا ہوا، ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کر لیا لیکن مسلمانوں نے اس کے بدلے جنم استھان پر قبضہ کر لیا، مسلمان اس موقع پر ہنومان گڑھی کے زینہ تک پہونچ گئے، پھر وہ کافی نقصان کے بعد پیچھے ڈھکیل دیے گئے، ہندوؤں نے ان کا پیچھا کامیابی کے ساتھ کیا، اور انھوں نے جنم استھان پر قبضہ کر لیا، اس

سلسلے میں پچہتر (۷۵) مسلمان ہلاک ہوئے، اور وہ گنج شہید اس میں دفن کیے گئے، "گیارہ ہندو بھی مارے گئے"، بادشاہ کی فوج یہ سب کچھ دیکھتی رہی، مگر اس کو حکم تھا کہ وہ اس جھگڑے میں دخالت نہ کرے، یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد و مندر میں عبادت اور پوجا کیا کرتے تھے، برطانوی حکومت کے زمانہ میں بیچ میں سلاخیں ڈال دی گئیں، تاکہ حد بندی کرکے جھگڑا روک دیا جائے، مسجد میں مسلمان نماز پڑھیں اور سلاخوں کے باہر ہندوؤں نے جو چبوترہ بنالیا ہے، اس پر وہ پوجا کیا کریں، اسی کے کچھ دنوں کے بعد امیٹھی کے مولوی امیر علی نے ہنومان گڑھی کی ایک پرانی مسجد پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، دو اور مسجدوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، عام لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ اورنگ شاہ کی بنائی ہوئی ہیں، اورنگ شاہ سے مراد اورنگ زیب ہے، لیکن یہ دونوں مسجدیں خوبصورت کھنڈر ہیں، رام دربار کے مندر کی بازیابی کے لیے ہندوؤں نے کچھ نہیں کیا، تریتا کا ٹھاکر کا جو پرانا کھنڈر تھا، اس کو کالپی کے راجہ نے پھر سے بنوایا، اس راجہ کی ریاست دو صدی پہلے پنجاب میں تھی، اس میں کچھ مزید اضافہ مرہٹہ کی رانی اہلیہ بائی نے کیا، اس نے اس کے متصل ایک گھاٹ بھی بنایا، وہ جسونت راؤ ہولکر کی بیوی تھی، اس خاندان کی طرف سے دو سو اکیس روپیے کی سالانہ رقم مقرر ہوئی جو اب تک جاری ہے۔

تبصرہ | اس گزیٹیر میں وہی باتیں زیادہ تر دہرائی گئی ہیں جو کارنیگی کی رپورٹ میں تھیں، مگر مرتب نے اپنی طرف سے پورے وثوق کے ساتھ یہ اضافہ بھی کر دیا ہے کہ:

"پہلے مندر (یعنی رام جنم استھان) پر بابر نے مسجد بنائی، اس میں تاریخ ۱۵۲۸ء لکھی ہوئی ہے، دوسرے مندر (یعنی سورگ دوار) پر اورنگ زیب نے ایک مسجد اور تیسرے (یعنی تریتا کا ٹھاکر) پر اسی بادشاہ یا اس کے کسی پیش رو نے ایک مسجد بنائی"

ایسے اہم بیانات کے لیے کسی مستند اور معاصر تاریخوں کا حوالہ دینا چاہیے تھا، تب ہی ایک مورخ کے نزدیک قابل قبول ہو سکتے ہیں، زبانی روایت کی سند کوئی سند نہیں ہوتی ہے، کارنیگی کی تحریر میں ایسی باتیں یقین کے ساتھ نہیں کہی گئی تھیں، کیننگھم کے یہاں بھی یہ صراحت نہیں ہے لیکن گزیٹیر کے مرتب کو فتنہ کی پرورش کرنی تھی اس لیے یہ سب کچھ لکھ گیا، اور اپنے جھوٹے دعویٰ کو اس جھوٹی تاویل سے مستحکم بنانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا تو یہ جانا بوجھا اصول ہے کہ جب وہ کسی قوم کو مغلوب کرتے ہیں تو اس پر اپنا مذہب نافذ کرتے ہیں، ایسے بیان کو صرف شر انگیزی لکھا کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے، گزیٹیر کے مرتب کو احساس تھا کہ جب تک رام جنم استھان کے مندر کے مسمار کرنے کا ثبوت مستند تاریخ سے پیش نہیں کیا جائے گا وہ قابل قبول نہیں ہوگا، اس لیے اس نے کارنیگی ہی کے اس بیان کو دہرا دیا ہے کہ تزک بابری کے وہ اوراق ہی گم ہیں جن میں بابر کے اجودھیا میں آنے کا ذکر ہوگا، پھر وہ اپنے بیان کو یہ لکھ کر خود مشکوک کر دیتا ہے کہ اگرچہ اجودھیا اس وقت (یعنی بابر کے زمانے میں) ویران ہو چکا تھا، مگر کم از کم رام جنم استھان کا عمدہ مندر ضرور رہا ہوگا، کیونکہ وہاں اب بھی کچھ ستون ہیں، اور اچھی حالت میں ہیں "کم از کم" اور "رہا ہوگا" سے ظاہر ہے کہ مرتب جو کچھ لکھ رہا ہے، اس پر خود اس کو یقین نہیں، لیکن وہ شر پیدا کرنا چاہتا تھا اس لیے یہ سب کچھ لکھ گیا، "کم از کم" سے یہ تعبیر کی جا سکتی ہے کہ وہاں صرف رام جنم استھان ہی تھا، پھر یہ الزام کیسے عائد کر دیا گیا ہے کہ ایک پر (یعنی سورگ دوار پر) اورنگ زیب اور دوسری (یعنی ترتیا کا ٹھاکر) پر اس کے کسی پیش رو نے مسجد بنا دی، اور جب پیش رو کا نام معلوم نہ تھا تو پیش رو لکھ کر صرف ہندوؤں کو برانگیختہ ہی کرنا تھا، گزیٹیر کے مرتب نے یہ بھی لکھا ہے کہ رام جنم استھان کے مندر کے کچھ ستون بابری مسجد میں ضرور لگائے گئے، مگر اس کے اس بیان سے اس کی تردید ہو جاتی ہے کہ میرے خیال میں یہ بودھوں کے ستون سے زیادہ ملتے جلتے ہیں، یعنی یہ ستون رام جنم استھان مندر کے نہیں ہیں، بلکہ بودھ مت کے

کسی مندر کے ہیں، ایسا ہونا ممکن ہے، بودھوں کے وہاں بہت سے مندر تھے، خانقاہیں بھی تھیں جن کو برہمنوں نے ختم کیا، وہاں ان کے مندروں کے کچھ ستون پڑے ہوں جن کو بابری مسجد میں لگا دیا گیا ہو، اس گزیٹیر میں ۱۸۵۵ء میں ہندو مسلمان کے خوں ریز تصادم کا ذکر ہے، مگر اس کے مرتب نے کارنیگی ہی کی طرح اس کے اسباب کا ذکر تفصیل سے نہیں کیا ہے، اور انگریزوں نے اس میں جو وحشیانہ کردار ادا کیا ہے اس کو بھی کارنیگی ہی کی طرح صرف نظر کرکے ان کے ظلم اور سفاکی پر پردہ ڈال دیا گیا ہے، ۱۸۵۵ء کے بلوے کے ذکر میں اس گزیٹیر کے مرتب نے کچھ ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلوہ دو مرتبہ مختلف زمانوں میں ہوا، حالانکہ گذشتہ اوراق میں یہ ذکر آیا ہے کہ ہنومان گڑھی کی مسجد کی بازیابی کے لیے پہلے شاہ غلام حسین بڑھے ان کے ہمراہیوں کا قتل عام ہوا تو پھر مولوی امیر علی امیٹھوی اٹھے، دونوں کی مہم گویا ایک تھی، اس سلسلہ میں مرتب بابری مسجد کو جنم استھان ہی کہہ کر ہندوؤں کو خوش کرتا ہے، پھر مرتب کے بیان کے مطابق ۱۸۵۵ء ہی کے بلوے کے موقع پر مسجد اور چبوترہ کے بیچ میں سلاخیں ڈال کر دونوں کی علحدہ علحدہ تقسیم کر دی گئی یہ بھی صحیح نہیں، پہلے توجہ دلائی گئی ہے، اس کی تقسیم نواب واجد علی شاہ ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی، اس گزیٹیر کے مرتب نے کارنیگی ہی کے اس بیان کو دہرادیا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد مندر میں عبادت اور پوجا کیا کرتے تھے، پہلے بھی ذکر آیا ہے کہ یہ بیان قابل قبول نہیں، صرف ہندو مسلمان میں فتنہ پیدا کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے، اکبر کی رواداری اپنی انتہا کو پہونچ گئی تھی، اس کے عہد میں بھی کوئی ایسی عبادتگاہ نہیں بنی جس میں مورتی کی بھی پوجا ہو، اور نمازیں بھی پڑھی جائیں،

آخر میں مرتب نے ہنومان گڑھی کے خلاف مولوی امیر علی کی مہم کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "دو اور مسجدوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، عام لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ اورنگ شاہ کی بنائی ہوئی ہیں

ورنگ شاہ سے مراد اورنگ زیب ہے، لیکن یہ دونوں مسجدیں خوبصورت کھنڈر ہیں" مرتب نے ان دو مسجدوں کے نام نہیں لکھے ہیں لیکن اگر مرتب کے بیان کو یقین کر لیا جائے تو اورنگ زیب نے ایک تو سورگ دوار کے مندر کو توڑ کر وہاں مسجد بنائی، پھر دو اور مسجدیں بنوائیں جن کا وہ نام نہیں لیتا ہے، اس طرح وہ تین مندروں کے انہدام کا الزام رکھتا ہے، لیکن آخری دو مسجدوں کا ذکر کرکے خوش ہے کہ یہ خوبصورت کھنڈر ہیں، جس سے یہ ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے ان کو مسمار کر دیا، مولوی امیر علی کی جنگی مہم تو ان ہی مسجدوں کے انہدام کے خلاف احتجاجاً تھی، مرتب کو دکھ تھا کہ رام دربار کے مندر کی بازیابی کے لیے ہندوؤں نے کچھ نہیں کیا، مگر حدیقۂ شہداء کے مصنف کے بیان کے مطابق رام دربار کی مسجد ۱۸۵۵ء سے پہلے ہی شہید کر دی گئی تھی (ص ۵) مرتب نے یہ بھی لکھا ہے ترتیا کا ٹھاکر کا جو پرانا کھنڈر تھا، اس کو کالپی کے راجہ نے پھر سے بنوایا، اس راجہ کی ریاست دو صدی پہلے پنجاب میں تھی، مرتب نے پہلے لکھا ہے کہ ترتیا کا ٹھاکر کے مندر پر اورنگ زیب کے کسی پیش رو نے مسجد بنائی تھی، مرتب کے بیان سے یہ واضح نہیں کہ اورنگ زیب کے پیش رو نے جو مسجد بنائی تھی اس کو مسمار کرنے کے بعد جو یہ کھنڈر بن گیا تھا اس پر کالپی کے راجہ نے کوئی مندر بنایا، یا پہلے ہی یہ کھنڈر تھا، اس پر اس نے ایک مندر بنایا، اگر یہ پہلے ہی کھنڈر بن گیا تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندو اس کی مذہبی اہمیت کے قائل نہ تھے، مرتب نے اورنگ زیب پر اجودھیا کے مندروں کے انہدام کا الزام اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر زیادہ سے زیادہ رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی تصدیق جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اورنگ زیب کے عہد کی معاصر تاریخوں سے نہیں ہوتی ہے اور نہ اورنگ زیب کے سب سے بڑے معاند اور ناقد مورخ سر جدو ناتھ سرکار نے اس کا ذکر کیا ہے کہ اس نے اجودھیا کے مندروں کو بھی مسمار کیا،

۱۸۸۱ء کا امپیریل گزیٹیر | ۱۸۸۱ء میں انڈیا کا امپیریل گزیٹیر ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر نے مرتب کیا تو اس نے

اجودھیا کا ذکر اس طرح کیا:

"یہ فیض آباد ضلع یعنی اودھ کا ایک قدیم شہر ہے، فیض آباد سے متصل ہے، گھاگھرا دریا کے دائیں یعنی جنوبی ساحل پر واقع ہے، اس کا عرض البلد ۲۶ - ۴۸ - ۲۰ اور طول البلد ۸۲ - ۱۴ - ۴۰ ہے، اجودھیا سے دلچسپی اس کی قدیم تاریخ کی وجہ سے ہے، موجودہ دور میں پرانا شہر بالکل غائب ہو چکا ہے، اور یہ کھنڈروں کا ڈھیر ہے، اور جنگلوں میں گم ہو گیا ہے، لیکن قدیم زمانہ میں اجودھیا ہندوستان کے عظیم ترین اور شاندار ترین شہروں میں سمجھا جاتا تھا، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ ۹۶ میل تک پھیلا ہوا تھا اور کوشل کی سلطنت کا دارالسلطنت تھا، اور اس میں موجودہ دور کا اودھ بھی شامل تھا، اور یہاں سورج بنسی خاندان کے راجہ دسرتھ کا دربار تھا، رامائن کے ابتدائی ابواب کے مطالعہ سے اس شہر کی شوکت اور یہاں کے فرماں رواؤں کی شان اور یہاں کے لوگوں کی نیکی، دولت اور اطاعت گذاری کا اندازہ ہوتا ہے، دسرتھ رام چندر کے باپ تھے جو رامائن کی رزمیہ شاعری کے ہیرو ہیں، جب اس سورج بنسی خاندان کے آخری فرماں روا کی موت ہوئی تو یہاں بودھوں کا تسلط قائم ہو گیا، برہمنوں کے قصے کے مطابق اجودھیا زوال پذیر ہو گیا، لیکن جب برہمنیت کا عروج راجہ بکرماجیت کے زمانہ یعنی ۵۷ ق م تک ہوا تو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اس قدیم شہر کی کھوج لگائی اور اس نے مختلف مندروں اور جگہوں کی نشاندہی کی، جو رام کی زندگی سے منسوب تھیں، ان میں سب سے اہم مقام رام کوٹ تھا، جو بادشاہ کا قلعہ اور محل تھا، پھر ناگیشور ناتھ مندر کی کھوج بھی لگائی گئی، جو مہادیو کے نام پر تھا، مانی پربت پہاڑی کی بھی تلاش کی گئی، اور اسی طرح اور مندروں کا بھی پتہ لگایا گیا، جہاں اب ہزاروں لوگ پہونچا کرتے ہیں، بکرماجیت کے بعد کوشل سلطنت پایۂ تخت اجودھیا کے ساتھ سمدرپال سری باستم اور قنوج کے خاندانوں کے ساتھ ہو گیا، یہاں تک کہ مسلمان فاتحوں

کے زیرنگیں ہوگیا، کوشل اس لیے بھی مشہور رہا کہ بودھ مت کا بہت بڑا مرکز رہا، جین فرقہ کے لوگ بھی یہاں رہے، اور ان دونوں مذہبی فرقوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے مذہب کے بانیوں کی جنم بھومی ہے، ہیون سانگ ساتویں صدی میں یہاں آیا، اور اس نے یہاں بودھوں کی بیس[۲۰] عبادت گاہیں دیکھیں، جن میں تین ہزار بھکشو اجودھیا میں رہتے تھے، برہمنوں کی بھی یہاں آبادی تھی، یہاں جینیوں کے بھی مندر ہیں، لیکن وہ حال کے بنے ہوئے ہیں، بعض مندر ڈیڑھ سو سال[۱۵۰] پہلے کے بنے ہوئے ہیں، اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ جینیوں کے پانچ مذہبی پیشواؤں کی پیدائش کی جگہ ہے، مسلمانوں کی فتح کی یادگار میں ان تین مسجدوں کے کھنڈر باقی ہیں، جو بابر اور اورنگ زیب نے ان جگہوں پر بنائیں جو ہندوؤں کے تین مشہور مقدس مقامات ہیں (۱) جنم استھان یعنی وہ جگہ جہاں رام چندر پیدا ہوئے (۲) سورگ دوار مندر، یعنی وہ جگہ جہاں رام چندر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جلائے گئے (۳) ترتیا کا ٹھاکر، جو اس لیے مشہور تھا کہ یہاں بڑی بڑی قربانیاں ہوتی تھیں، اجودھیا میں اس وقت ایک ہزار چھ سو ترانوے[۱۶۹۳] گھر ہیں، سات ہزار پانچ سو اٹھارہ[۷۵۱۸] کی آبادی ہے، جن میں چار ہزار چار سو ساٹھ[۴۴۶۰] ہندو ہیں، اور دو ہزار پانچ سو انیس[۲۵۱۹] مسلمان ہیں، پانچ سو بانوے[۵۹۲] بقیہ اور لوگ ہیں، چھیانوے[۹۶] ہندو مندر ہیں، جن میں تریسٹھ[۶۳] وشنو اور تینتیس[۳۳] شیو جی کے ہیں، چھتیس[۳۶] مسلمانوں کی مسجدیں ہیں، درشن سنگھ یا مان سنگھ کا مندر اب سے پچیس[۲۵] برس پہلے بنایا گیا تھا، اور بہو بیگم کا مقبرہ بہترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس کو شاہ اودھ نے بنایا، یہاں تجارت بہت تھوڑی مقامی طور پر ہوتی ہے، البتہ رام نومی میلہ بہت بڑا ہوتا ہے، جس میں پانچ[۵] لاکھ ہندو شریک ہوتے ہیں۔"

تبصرہ | ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر نے بعض باتیں وہی لکھی ہیں جو کارنیگی نے سنہ ۱۸۶۲ء اور کیننگھم نے سنہ ۱۸۶۲ء اور سنہ ۱۸۷۷ء کے فیض آباد گزیٹیر کے مرتب نے لکھی تھیں، لیکن اس میں جب یہ لکھا گیا کہ

بابری مسجد کھنڈر میں تبدیل ہو گئی تو یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ مسجد اسی طرح قائم ہے، اور اسی کے لیے سارا جھگڑا ہے، لیکن اُن کے اس بیان کے اس ٹکڑے پر غور کیا جا سکتا ہے کہ "بابر اور اورنگ زیب کی مسجدیں ہندوؤں کے مندروں کے نزدیک نہیں"۔ صحیح تو یہ ہے کہ مسجدیں ان مندروں کے نزدیک نہیں، مگر انگریزوں نے ہندوؤں کو برانگیختہ کرنے اور اکسانے کے لیے یہ لکھنا شروع کیا کہ یہ مندروں کی جگہوں پر نہیں، اس گزیٹیر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ۱۸۵۰ء تک بودھوں کے سارے آثار اجودھیا سے ختم کر دیے گئے تھے۔

۱۸۸۳ء کا مقدمہ | ۱۸۸۳ء میں ہندو مسلمانوں میں مسجد کی سفیدی کے سلسلہ میں پھر مقدمہ بازی شروع ہوئی، جس کی تفصیل حسب ذیل مقدمہ سے معلوم ہوگی:

نقل احکام ۲۸ر نومبر ۱۸۸۳ء مرسل نمبر ۱۹۳۳۵

محلہ کوٹ رام چندر اجودھیا

سید محمد اصغر خطیب بنام رگھوبر داس مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۸۸۳ء

اجلاس

حکم ہوا کہ مرزا محمود بیگ صاحب کے پاس بھیج کر لکھا جاوے کہ بعد تحقیقات کے رپورٹ کریں کہ منجانب سائل کس کس طرف سفیدی ہوئی ہے، اور منجانب ہندوؤں کے کس کس طرف قیاس کیا جاتا ہے کہ پچھم طرف کے ٹکڑوں پر مسلمانوں کی طرف سے اور پورب کی طرف کے ٹکڑوں پر ہندوؤں کی طرف سے سفیدی ہو رہی ہے۔

رپورٹ بھیجے اندر دو ہفتہ کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۸ر نومبر ۱۸۸۳ء مقام جلال آباد

تبصرہ | اس درخواست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے مسجد کی سفیدی کے

سلسلہ میں چھیڑ چھاڑ کی خاطر ایک تنازعہ کھڑا کر دیا گیا۔

۱۸۸۳ء کے مقدمہ کے ایک حکم نامہ کی نقل | نقل حکم نامہ تعمیلیہ حکم ..... محمد اصغر در گھوبیر میں تعمیل ہوا، مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۸۳ء ..... مجریہ نمبر ۱۹۳۳۵

محلہ کوٹ اجودھیا سید محمد اصغر خطیب مدعی بنام رگھوبیر داس

مورخہ ۲۲ جنوری ۱۸۸۴ء اجلاس

بحکم محمود ملک صاحب اسسٹنٹ کمشنر بہادر

سید محمد اصغر خطیب و مؤذن مسجد بابری مدعی

بنام مہنت رگھوبیر داس مہنت چبوترہ جنم استھان مدعا علیہ

حکم نامہ بنام

در حکم اطلاع نامہ × سید محمد اصغر خطیب و مؤذن مسجد بابری و مہنت رگھوبیر داس مہنت استھان تم کو دیگر حکم ہوتا ہے کہ ہر دو فریق کو دیگر اور دستخطان کے ..... حکم نامہ ..... لکھا کر رپورٹ تعمیلی پیش کرو، تاکید جانو۔

المرقوم ۵ دسمبر ۱۸۸۳ء

تبصرہ | اسسٹنٹ کمشنر کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ فریقین کوئی مزید کارروائی نہ کریں جب تک اس کے متعلق باضابطہ رپورٹ نہ آجائے۔

۱۸۸۴ء کا مقدمہ | ۱۸۸۴ء میں بھی ہندو مسلمانوں میں کچھ تنازعہ پیدا ہوا، جس کی تفصیل حسب ذیل درخواست کی نقل سے معلوم ہوگی:

سید محمد اصغر ..... ۲ نومبر ۱۸۸۴ء ..... منعقدہ ۲۲ جنوری ۱۸۸۴ء

سید محمد اصغر خطیب و متولی جامع مسجد بابری واقع اودھ

بنام

رگھوبیرداس مہنت چبوترہ جنم استھان ساکن اودھ

غریب پرور! سلامت تصریح دعویٰ:

حال شرارت مدعیٰ علیہ کہاں تک عرض کروں کہ طویل ہے، مختصر یہ ہے کہ دیوار احاطہ مسجد بابری کے اندر چبوترہ جنم استھان مدعیٰ علیہ کا ہے، مدعیٰ علیہ کو سوائے چبوترہ کے دیوار احاطہ بیرونی سے یا گھیرے سے یا پھاٹک سے کوئی واسطہ نہیں ہے کل متعلق مسجد محدوحہ سے ہے، و علامات و نشانات اس کی مسجد کی ہیں، بلکہ اوپر دروازہ کے جو دیوار بیرونی کا ہے، اس پر اللہ مرقوم ہے، مطابق اس کے قبض و تصرف سائل میں چلا آتا ہے، جب ضرورت مرمت وغیرہ کی ہوتی ہے، سائل نے مرمت کروائی . . . . ہے، بلکہ عرصہ تین[۳] سال کا ہو چکا ہے کہ دیوار پھاٹک کی گر گئی تھی مرمت ہوئی، اور خرچ کر کے مرمت کرایا ہے اور ہمیشہ سے سفیدی ہمراہ مسجد کے دیوار و پھاٹک کے ہر سال کرتا رہا ہے، جیسا کہ امسال بھی حسب معمول سامان سفیدی کا کیا، مگر مدعیٰ علیہ سفیدی دیوار پھاٹک پر کرنے کے حارج ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم سفیدی کریں گے . . . . سفیدی مسجد کی ملتوی ہے، تھانہ اطلاع کیا، افسر نے نہایش کی کہ تین جگہ پر کرو، باوجودے کہ مدعیٰ علیہ کی جگہ سوائے چبوترہ یا رسوئیں دوسری نہیں ہے، دیوار پھاٹک ہمراہ مسجد کے تعمیر ہوا ہے، مدعیٰ علیہ سے واسطہ نہیں ہے، نہایش پر نظر نہیں ہے، بلکہ موجودہ مدعیٰ علیہ ہمہ وقت آمادہ فوجداری کے رہتا ہے، جب جب مدعا علیہ نے کچھ کچھ زیادتی کا ہے تب تب عدالت سے باز رکھا گیا ہے، مکان مدعیٰ علیہ . . . . حضور میں گذارکر امیدوار ہوں۔

بہ تحقیقات مندرجہ بالا وملاحظہ حسب دیوار و عمارت مسجد مدعیٰ علیہ کو باز رکھا جائے،

له سائل سفیدی دیوار و پھاٹک پر کرے، واجب عرض کیا،

مورخہ ۲ر نومبر ۱۸۸۳ء

فدوی محمد اصغر متولی و خطیب مسجد بابری واقع اودھ

صرہ | نومبر ۱۸۸۳ء کی درخواست سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب احاطہ میں ایک
چبوترہ بن گیا گو کہ پہلی درخواست میں یہ صراحت موجود تھی کہ صدیوں سے زمین خالی
پڑی تھی، اسی درخواست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باہری دیوار، گھیرے اور پھاٹک
سے مدعٰی علیہ کو کوئی واسطہ نہیں، یہ ساری چیزیں مسجد کی ہیں کیونکہ تمام علامات و نشانات
مسجد کے ہیں، یہاں تک کہ دروازہ کے اوپر لفظ اللہ مرقوم ہے، مسجد کے متولی ہمیشہ سے
مسجد کے ساتھ دیوار اور پھاٹک کی سفیدی کراتے رہے ہیں، لیکن اس سال سفیدی کا
سامان منگانے کے بعد مدعٰی علیہ نے مزاحمت کی،

| ۱۸۸۵ء کے مقدمہ کی تفصیل |

اس کے بعد اجودھیا کے مہنتوں نے ۱۸۸۵ء میں ایک مقدمہ
دائر کیا، اس میں مہنت رگھوبیر داس مہنت استھان واقع اجودھیا
نے اس زمانہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو مدعٰی علیہ بناکر یہ درخواست دی :

"مہنت رگھوبیرداس مہنت استھان واقع اجودھیا مدعی بنام کونسل میں ہندوستان
کے سکریٹری آف اسٹیٹ مدعٰی علیہ مذکورہ صدر مدعی نے ریاست کے سامنے درج درخواست
کی، اجودھیا میں واقع چبوترہ جنم استھان پر مندر کی تعمیر کے لیے مدعٰی علیہ کی طرف سے
ممانعت کے مقابلہ میں مدعی کو تفویض اجازت سے متعلق مقدمہ (چبوترہ کا سائز) شمال
میں ۱۷ فٹ، مشرق میں ۲۱ فٹ ہے، بازار کے دام کے مطابق اس کی کوئی قیمت نہیں لگائی
جاسکتی، لہٰذا مدعی کے بیان کے مطابق جیساکہ ایکٹ ۱۸۰۵ کے قانون کلاز ۱۱ دفعہ ۱۷ میں

دیا گیا ہے، کورٹ فیس بقدر ..... روپیے دے دی گئی ہے، جائے وقوع کی پوری وضاحت منسلک نقشہ سے ہو سکتی ہے،

(۱) شہر فیض آباد میں اجودھیا کے مقام پر واقع جنم استھان ہندوؤں کی ایک پرانی اور مقدس عبادت گاہ ہے، اور مدعی (۱) عبادت گاہ کا مہنت ہے۔

(۲) جنم استھان کا چبوترہ مشرقی اور مغربی جانب سے اکیس [۲۱] فٹ لمبا اور شمالی اور جنوبی جانب سے سترہ [۱۷] فٹ ہے، وہیں پر "چرن پنیہ" بھی ہے، اور اس پر ایک چھوٹا مندر بھی ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے۔

(۳) مذکورہ چبوترہ مدعی کے قبضہ میں ہے، اور چونکہ اس چبوترے پر کوئی عمارت بنی ہوئی نہیں ہے اس لیے مدعی اور دوسرے کو موسم گرما میں شدید گرمی، جاڑے میں شدید سردی اور برسات میں بارش کی وجہ سے سخت پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر چبوترے کے اوپر مندر بنا دیا جائے تو اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، بلکہ مندر کی تعمیر سے مدعی اور دوسرے فقیروں اور یاتریوں کو ہر طرح کی سہولت حاصل ہوگی۔

(۴) فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر نے مارچ یا اپریل ۱۹۵۰ء میں کچھ مسلمانوں کی طرف سے اعتراض کی بنا پر مندر کی تعمیر پر ممانعت عائد کر دی تھی، جس پر اس درخواست گذار نے مقامی بلدیہ کے سامنے ایک پٹیشن داخل کی، لیکن جب اس کا کوئی جواب نہ ملا تو مدعی نے ۱۸ اگست ۱۹۵۰ء کو سی. پی. سی کی دفعہ ۸۰ کے تحت لوکل گورنمنٹ کے سکریٹری کے آفس کو ایک نوٹس بھیجا، لیکن اس کا بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا، لہٰذا اس مقدمہ کے لیے قانونی چارہ جوئی کا سبب اجودھیا میں حکم امتناعی کی تاریخ سے ہی پیدا ہو گیا ہے، جو کہ اس عدالت کے اختیار سماعت کی مقامی حد کے اندر ہے۔

(۵) ایک عام آدمی جو ریاست کا خیر خواہ ہے اسے اس زمین پر جو اس کی ملکیت اور تصرف میں ہے اپنی پسند کی کسی بھی طرح کی عمارت بنانے کا حق حاصل ہے، اور حکومت جو کہ جائز اور برحق ہے بروئے ذمہ داری اپنی رعیت کے تحفظ کی، اپنے حقوق کے حصول میں ان کی مدد کرنے کی اور نظم و قانون کی برقراری کے لیے ضروری احتیاطی اقدامات کرنے کی پابند ہے، لہذا یہ درخواست کی جاتی ہے کہ اجودھیا میں واقع چبوترہ جنم استھان کے اوپر جس کی اراضی شمال میں ۱۷ فٹ، مشرق میں ۲۱ فٹ، جنوب میں ۱۷ فٹ، مغرب میں ۲۱ فٹ ہے، ایک مندر کی تعمیر کی اجازت اور مندر کی تعمیر سے مدعی کو روکنے یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کے خلاف مدعا علیہ کو باز رہنے کی تاکید پر مشتمل ایک حکم جاری کیا جائے، اس مقدمہ کی لاگت مدعیٰ علیہ فریقوں پر عائد کی جائے۔

میں رگھوبیر داس مہنت جنم استھان اجودھیا بحیثیت مدعی اعلان کرتا ہوں کہ اس دعویٰ میں شامل کیے گئے جملہ مندرجات میرے ذاتی علم اور یقین کی حد تک درست ہیں۔

دستخط مہنت رگھوبیر داس تاریخ ۲۹ جنوری ۱۸۸۵ء"

(بشکریہ مسلم انڈیا اردو۔ مئی ۱۹۸۶ء)

تبصرہ | اس درخواست میں اس بات کی التجا نہیں کی گئی ہے کہ بابری مسجد جس جگہ توڑ کر بنائی گئی ہے وہ جگہ دلائی جائے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ یہ مسجد کسی مندر کی جگہ پر بنائی گئی ہے، بلکہ درخواست یہ ہے کہ چبوترہ پر کوئی عمارت بنی ہوئی نہیں ہے، اس لیے مدعی اور دوسروں کو موسم گرما میں شدید گرمی اور جاڑے میں شدید سردی اور برسات میں بارش کی وجہ سے پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے چبوترے کے اوپر مندر بنانے کی اجازت دی جائے، اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ۱۸۸۵ء کے ہندوؤں نے تسلیم کرلیا کہ بابری مسجد

رام جنم بھومی کو توڑ کر نہیں بنائی گئی، اس کی وضاحت اسی مقدمہ کے فیصلہ سے بھی ہو جائے گی، اس زمانہ میں اتفاق سے فیض آباد عدالت کے سب جج پنڈت ہری کشن تھے، ان کا جو فیصلہ ہوا تو اس سے ان پر کوئی یہ الزام نہیں رکھ سکتا ہے کہ ہندوؤں پر ظلم کرنے کی خاطر، بے انصافی سے کام لے کر یہ فیصلہ دیا، ہم اس فیصلہ کی پوری نقل یہاں پر پیش کرتے ہیں، اس میں کچھ قانون کی وضاحت بھی ہے، جو ہماری اس تحریر کے لیے ضروری نہیں ہے، مگر ہم اس لیے نقل کر دیتے ہیں کہ یہ پورا فیصلہ اس کتاب میں محفوظ ہو جائے،

فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن کا فیصلہ

نقل فیصلہ پنڈت ہری کشن سب جج فیض آباد
مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۸۸۵ء

فیصلہ بابت اجازت تعمیر مندر

یہ مقدمہ آج مدعی اور اس کے وکیل مختار کو کل وکیل اور سرکاری وکیل پنڈت بشمبھر ناتھ اور محمد اصغر مدعیٰ علیہ اور اس کے وکیل مختار کی موجودگی میں پیش کیا گیا، ریکارڈ میں شامل جملہ کاغذات کے معاینہ میں یہ ثابت ہے کہ مدعی جنم استھان (جائے پیدائش) کا مہنت ہے، اس تعلق سے ایک مقدمہ سکریٹری آف اسٹیٹ کے خلاف پیش کیا گیا تھا جس کے بعد محمد اصغر اپنی درخواست کے مطابق اس مقدمہ کا مدعیٰ علیہ قرار پایا، مدعی کا کیس بالاختصار درج ذیل ہے:

"چبوترہ (پلیٹ فارم) جنم استھان، مشرق و مغرب ۲۱ فٹ، شمال و جنوب ۱۷ فٹ پر مدعی کا قبضہ ہے، اور چونکہ چبوترے کے اوپر کوئی عمارت نہیں ہے، اس لیے مدعی اور دوسرے فقیروں کو ہر موسم میں گرمی میں انتہائی گرمی کی وجہ سے، جاڑے میں شدید ٹھنڈک کی وجہ سے اور برسات میں بارش کی وجہ سے سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر ایک مندر کی تعمیر کر دی جائے تو کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا اور پوجا پاٹ جو اس وقت کی جاتی ہے، اسی طریقہ پر اسی طریقہ پر

مستقبل میں بھی جاری رہے گی، لہٰذا مدعی نے درخواست کی ہے کہ اس کے نام مذکورہ چبوترے کے اوپر ایک مندر بنانے کی اجازت پر مشتمل ایک حکم جاری کیا جائے، اس مقدمہ کے لیے قانونی چارہ جوئی کی علت کے وقوع کی تاریخ ۱۵ر جون ۱۹۸۵ء معلوم ہوتی ہے، فاضل سرکاری مختار نے اپنے تحریری بیان میں کہا ہے کہ مدعی کو چبوترے سے بے دخل نہیں کیا گیا ہے، لہٰذا اس مقدمہ کے لیے قانونی چارہ جوئی کی کوئی علت مدعی کے پاس موجود نہیں ہے، اور اس مقدمہ کی قانونی مدت چارہ جوئی محدود ہے، اور مدعی اس ریلیف کا حقدار نہیں ہے جس کا اس نے دعویٰ کیا ہے، محمد اصغر مدعیٰ علیہ نے اپنے تحریری بیان میں مندرجۂ ذیل حقائق پیش کیے ہیں، جو مختصراً اس طرح ہیں:

عرضی دعویٰ پر ادا کی گئی کورٹ فیس ناکافی ہے، کورٹ فیس عمارت کی مالیت کے اعتبار سے ادا کی جانی چاہیے تھی، اور یہ کہ مقدمہ قانونی لحاظ سے تمادی ہو چکا ہے، اس زمین کا رقبہ جسے چبوترے کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے کافی زیادہ ہے، اور وہ زمین مدعی کے قبضہ میں نہیں ہے، اور مدعی کو مذکورہ زمین پر کوئی مندر بنانے سے متعدد مرتبہ روکا جا چکا ہے،

مقدمہ کے حقائق کے پیش نظر درج ذیل نکات تحقیق طلب تنقیح قرار پاتے ہیں۔

(۱) کیا عدالتی فیس جو ادا کی گئی ہے، کافی ہے؟

(۲) کیا مقدمہ قانونی مدت سماعت کے ذریعہ محدود ہے؟

(۳) اگر نہیں، تو کیا قانونی چارہ جوئی کی کوئی علت ہے؟

(۴) جو ریلیف طلب کی گئی ہے، قانوناً جائز ہے، یا نہیں؟

(۵) مقدمہ میں زیر بحث چبوترے کی آراضی کیا ہے؟

(۶) چبوترے کے نام سے معروف مذکورہ زمین متعلقہ فریقوں میں سے کس کی ملکیت

اور قبضہ میں ہے ؟

ان میں سے سوالات نمبر ۱، ۳، ۴ اور ۶ کا بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے اور سوال نمبر ۲ کا ثبوت مدعیٰ علیہ کو فراہم کرنا ہے، جبکہ سوال نمبر ۵ کا تعلق پیمائش سے ہے، سوال نمبر ۶ کے تحت مدعی کے دعویٰ کی تردید مدعیٰ علیہ کو کرنی ہے، متنازعہ جگہ کا نقشہ گوپال سہائے امین کے ذریعہ تیار کیا گیا، اور ریکارڈ میں شامل کیا گیا، متعلقہ جگہ کے معاینہ کے وقت جو ترمیم بھی ضروری سمجھی گئی، عمارت میں وہ ترمیم نقشہ میں شامل کی گئی ہے، متعلقہ فریقوں کی جانب سے مذکورہ بالا نکات کے ثبوت میں درج ذیل دستاویزات فائل کی گئی ہیں:

مدعی کے ذریعہ فراہم کردہ دستاویزی ثبوت۔

گزیٹیرات اودھ جلد سے اقتباس کی نقل جو کہ حکومت کے آرڈرس کے تحت ضروری تھی اقتباس برائے جنرل ہسٹارک سوسائٹی مع ترجمہ اردو۔

مدعیٰ علیہ کی طرف سے فراہم کردہ دستاویزی ثبوت۔

قائم مقام ڈپٹی کمشنر ایم۔ مرفرد کا آرڈر، جس کے ساتھ آرڈر کی نقل منسلک کی گئی۔

رسوئی کے انہدام سے متعلق اسسٹنٹ کمشنر مسٹر ڈسوئر کا فیصلہ اور ڈپٹی کمشنر مسٹر اوڈینرند کی اجازت۔

پیپر پر سابق ڈپٹی کمشنر مسٹر فاربس کے دستخط ہیں، تاریخ ۲۰ر فروری ۱۸۸۳ء ڈپٹی کمشنر کے آرڈر مجریہ ۱۴ر دسمبر ۱۸۸۵ء کی نقل۔

رجب علی بنام الن سنگھ کے مقدمہ میں شاہ کی عدالت سے دیے گئے فیصلہ کی نقل مورخہ ۳ر دسمبر ۱۸۶۰ء ، ۱۳ر مارچ ۱۸۶۱ء۔

نزول ہنڈ کے داروغہ بھیلا ناتھ کی طرف سے دیے گئے ریمارکس مورخہ ستمبر ۱۸۹۶ء

کی نقل۔

نقل آرڈر مرزا خداداد بیگ بہ مطابق اجازت ڈپٹی کمشنر مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۵۸ء

نقل آرڈر اسسٹنٹ کمشنر سید محمد اصغر بنام گوبند رام۔

نقل عذرداری منجانب گورکھ سنگھ ساکن لاہور، مورخہ ۱۸ر مئی ۱۹۵۳ء

نقل عذرداری اور آرڈر..... مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۶۵ء۔

جائے وقوع کی ایک انکوائری متعلقہ فریقوں ان کے مختار وکیلوں اور تحصیل لینڈ کے دارو غہ کی موجودگی میں کی گئی مدعی اور محمد اصغر مدعیٰ علیہ کی جانب سے گواہ پیش کیے گئے، اور ان کے بیانات ریکارڈ کیے گئے، یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ ریاست کی جانب سے کوئی عینی شاہد پیش کیا جائے، فریقوں کے مختاروں کے ایشو نمبر ۱ سے متعلق دلائل سننے کے بعد یہ واضح ہے کہ مدعی جس دادرسی کا طالب ہے وہ اس نوعیت کی ہے کہ مندر کی تعمیر کی اجازت دی جا سکتی ہے، محمد اصغر کی جانب سے لگائے گئے اعتراضات یہ ہیں کہ عدالتی فیس کی ادائگی تعمیر کیے جانے والے مندر کی مالی قیمت پر ادا کی جانی چاہیے، یا اس کا تخمینہ چبوترے کی مالی قیمت کی بنیاد پر لگایا جانا چاہیے، سن ۱۸۷۰ء کے قانون کے جزو دوم دفعہ ۷، کلاز ۴ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مقدمہ میں زیر بحث جائداد کی قیمت کا تعین بازار کی شرح کے مطابق کیا جا سکتا ہے، اور اس پر دس روپیے کا اسٹامپ کافی ہے، مندر کی تعمیر ایک سو روپیے میں ہو سکتی ہے، ایک ہزار میں بھی اور کئی ہزار روپیے میں بھی، اس کی کوئی حد نہیں ہو سکتی، لہٰذا اس طرح کی تعمیر کی اجازت کے لیے بازار کی شرح کے مطابق کوئی قدر اندازی نہیں ہو سکتی چبوترے پر قبضہ کے سلسلہ میں کوئی دعویٰ نہیں ہے اس لیے عدالتی فیس چبوترے کی قیمت پر عائد ہو سکتی ہے، اور اس بنا پر دس روپیے کا اسٹامپ کافی ہے۔

جہاں تک ایشو نمبر ۲ کا تعلق ہے، میرے علم میں بات لائی گئی ہے کہ ضابطۂ فوجداری دفعہ

۱۴۳ کے تحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت سے کوئی اطلاع مدعی کو نہیں دی گئی ہے، جس کی منسوخی کا وہ حقدار ہے، گورکھ سنگھ (پنجابی) نامی ایک شخص مندر کی تعمیر کے لیے پتھر لایا تھا، ڈپٹی کمشنر کی طرف سے گورکھ سنگھ کے نام حکم اس مفہوم کا ہے کہ اسے وہاں سے پتھر ہٹا لینا چاہیے، مذکورہ افسر کا یہ آرڈر اس معنی میں واضح ہے کہ مندر کی تعمیر کی اجازت گورکھ سنگھ کو نہیں دی جا سکتی تھی، جو منشی رام لال اور رام مراری رائے بہادر کا کارندہ ہے، جو مندر کی تعمیر کے لیے پتھر لایا تھا، اور کمشنر نے اپیل اس بنیاد پر مسترد کر دی تھی تاکہ اس سلسلہ میں کوئی پیشگی منظوری جواز روئے قانون ضروری ہے، نہیں لی گئی ہے، چونکہ مدعی پر چبوترے پر مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی، اس لیے وہ پابندی سے متعلق کسی حکم کی منسوخی کے حصول کا پابند نہیں ہے، سرکاری وکیل مختار کی جانب سے جو کیس پیش کیا گیا ہے، وہ مناسب محل نہیں ہے، کیونکہ میرے سامنے جو معاملہ پیش کیا گیا ہے اس میں مدعی کے خلاف ایک آرڈر جاری کیا گیا ہے جبکہ زیر نظر معاملہ میں چبوترے پر مندر کی تعمیر کے تعلق سے مدعی کے خلاف کوئی آرڈر جاری نہیں کیا گیا ہے، اس کے علاوہ سنہ ۱۸۷۷ء کے ایکٹ نمبر ۵ کی دفعہ نمبر ۲۳ کو دیکھتے ہوئے یہ واضح ہے کہ اس قسم کے معاملات میں مقدمات کسی بھی وقت داخل کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ ہر اس موقع پر اجازت دینے سے انکار کیا جائے، چارہ جوئی کی تازہ علت یہ ہوگی، اور ایک نیا مقدمہ داخل عدالت کیا جا سکتا ہے، مزید برآں اس طرح کے مقدمات کے لیے قانون تمادی کی کوئی متعین دفعہ موجود نہیں ہے، چنانچہ یہ مقدمہ تمادی نہیں ہوا ہے۔

رہا تیسرا مسئلہ تو مدعا علیہ کے عذر تمادی کی غیر موجودگی میں علت چارہ جوئی فراہم ہو چکی ہے اور یہ کہ جو علت چارہ جوئی مدعی کو حاصل ہوئی ہے وہ غلط ہے، اور اس کے ساتھ ہی مدعی کو چبوترے پر مندر کی تعمیر سے روکا جا رہا ہے، اور لوکل گورنمنٹ کے نام مدعی کی درخواست پر

کوئی آرڈر جاری نہیں ہوا ہے، لہٰذا علت چارہ جوئی نی الواقع مدعی کو حاصل ہو گئی ہے، اور مدعی نالش کرنے کا حقدار ہے۔

رہا تیسرا مسئلہ تو جانیے: تو رع کی پیمائش کی گئی ہے، اور یہ پیمائش مقدمہ میں پیش کیے گئے نقشہ کے مطابق درست پائی گئی ہے، اور محمد اصغر کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا ہے، جب کہ دوسری طرف یہ پیمائش انچوں میں کم اور فٹ کے اعتبار سے درست ہے۔

جہاں تک ایشو نمبر ۶ کا تعلق ہے اس جگہ کے معاینہ کے بعد یہ واضح ہے کہ چرن (پاؤں) چبوترے پر ابھارا ہوا ہے، جس کی پوجا کی جاتی ہے، اس چبوترے پر بنے ہوئے ایک اور چبوترے پر ٹھاکر جی کی ایک مورتی نصب کی ہوئی ہے، چبوترہ مدعی کے قبضہ میں ہے بلعد وہاں جو بھی چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں انھیں مدعی لے جاتا ہے، اور اس کا اعتراف محمد اصغر مدعیٰ علیہ کو بھی ہے، مدعی کے گواہ بھی مدعی کا قبضہ ثابت کرتے ہیں، آگے جو سے وہاں باڑ کی طرح ایک پختہ دیوار مسلمانوں اور ہندوؤں کی مقبوضہ اراضی کی حدود متعین کرنے کے لیے بنائی گئی ہے اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا، مدعی کے گواہ چبوترے پر مدعی کے قبضہ سے اپنی واقفیت کا اظہار کرتے ہیں، مسجد اور چبوترے کے درمیان ایک دیوار ہے جسے امین کے تیار کردہ تصحیح شدہ نقشے میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ مسجد اور چبوترے کے درمیان الگ الگ باؤنڈری ہے، اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ وہاں حالیہ تنازع سے قبل حکومت کی جانب سے تعمیر کردہ ایک باؤنڈری لائن موجود ہے، اس سے قبل ہندو اور مسلم دونوں ہی اس مقام پر نماز اور پوجا کا کام کرتے تھے، ۱۸۵۵ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے کے بعد مزید جھگڑوں کا امکان ختم کرنے کے لیے درمیان میں ایک دیوار بنا دی گئی، تاکہ مسلمان دیوار کے اندرونی جانب عبادت کریں اور ہندو

دیوار کی باہری جانب پوجا کریں، لہٰذا چبوترہ اور چہار دیواری کے باہر کی زمین ہندوؤں اور مدعی کی ہے۔

اب رہ جاتا ہے یہ مسئلہ جس پر مقدمہ خارج کیے جانے یا اس پر کوئی حکم جاری کیے جانے کا انحصار ہے، یہ مقام دوسرے مقامات کی طرح نہیں ہے، جہاں اس کے مالک کو اپنی پسند سے کوئی بھی عمارت بنانے کا حق حاصل ہو، نقشہ کے معاینہ سے یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ صورت حال ایسی ہی ہے، مندر کی تعمیر کے لیے اجازت کی درخواست ایک ایسی جگہ سے متعلق ہے، جہاں مندر اور مسجد دونوں میں داخلہ کا صرف ایک ہی دروازہ ہے، وہ جگہ جہاں ہندو پوجا کرتے ہیں قدیم زمانہ سے ان کے قبضہ میں ہے اور ان کی ملکیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا اور اس کے گرد مسجد کی دیوار ہے، اور اس دیوار پر "اللہ" کا لفظ کندہ ہے، اگر ایسے مقام پر چبوترے پر کوئی مندر بنایا جاتا ہے تو جب ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایک ہی راستہ سے گذریں گے تو مندر کی گھنٹیوں اور سنکھ کی آواز گونجے گی، اگر ہندوؤں کو مندر کی تعمیر کی اجازت دے دی جائے تو ایک نہ ایک دن کوئی ہنگامہ شروع ہو کر رہے گا، اور ہزاروں افراد ہلاک ہوں گے، نظم و قانون کی پامالی کے اس سبب کے تحت متعلقہ فریقوں کو کسی بھی نئی تعمیر سے روک دیا ہے، لہٰذا یہ عدالت بھی معقول اور مناسب تصور کرتی ہے کہ اس مقام پر مندر کی تعمیر کی اجازت دینا فساد اور خوں ریزی کی بنیاد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ڈالنا ہے، جو دو مختلف مذہبوں کے ماننے والے ہیں، لہٰذا جو داد رسی چاہی گئی ہے وہ بہ تقاضائے انصاف منظور نہیں کی جانی چاہیے، قانون اقرار عہد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عدالت اس امر واقعہ سے واقف ہے کہ کسی بھی فریق کو اقرار عہد کی ہدایت نہیں دی جانی چاہیے جو کہ پبلک پالیسی کے خلاف ہے۔

ان اسباب کے تحت جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، عدالت کی رائے یہ ہے: مدعی کی جانب سے جو ریلیف طلب کی گئی ہے، وہ قانون کے مطابق نہیں ہے، اور یہ مسئلہ (۴) مدعی علیہ فریقان کے حق میں فیصل کیا جاتا ہے، اور دیگر مسائل مدعی کے حق میں فیصل کیے جاتے ہیں، اور اس کی رو سے ہدایت کی جاتی ہے، کہ سی۔ پی۔ سی کی دفعہ ۱۹۸ کے تحت مدعی کا مقدمہ خارج کیا جائے، دونوں فریقان اپنے اپنے اخراجات برداشت کریں، مقدمہ کی مثل ریکارڈ روم کے حوالہ کی جائے۔ دستخط ہری کشن سب جج تاریخ ۲۴ دسمبر ۱۸۸۵ء

(بہ شکریہ مسلم انڈیا، اردو دسمبر ۱۹۸۶ء)

تبصرہ | اس فیصلہ میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ "اس کے قبل مسلمان اور ہندو دونوں ہی اس مقام پر نماز پڑھتے اور پوجا کرتے تھے" تو یہ انگریزوں ہی کی آواز بازگشت ہے، اس مقام سے مراد اگر مسجد ہے تو یہ صحیح نہیں، اور اگر اس مقام سے مراد مسجد اور چبوترہ کی جگہیں ہیں تو پھر مقام کا لفظ قابل قبول ہے، اور پھر فیصلہ میں یہ بھی ہے کہ "مندر کی تعمیر کے لیے اجازت کی درخواست ایک ایسی جگہ سے متعلق ہے جہاں مندر اور مسجد دونوں میں داخلہ کا صرف ایک ہی دروازہ ہے"، اس سے تو ظاہر ہے کہ مسجد کے پاس مندر بھی تھا، اگر جب وہاں مندر تھا، تو چبوترہ پر مندر بنانے کی اجازت کیوں مانگی گئی، یہاں پر مندر سے مراد شاید چبوترہ ہی ہو، جہاں ہندو پوجا کرتے تھے، اس کی تصریح اس اپیل کی سماعت سے ہو جاتی ہے جو اس فیصلہ کے بعد ایک انگریز ڈسٹرکٹ جج کے یہاں کی گئی تھی اس اپیل کے فیصلہ میں ڈسٹرکٹ جج نے لکھا تھا" احاطہ میں داخلہ ایک پھاٹک کے راستہ سے ہے جس پر اللہ کا لفظ کھدا ہوا ہے اور ٹھیک بائیں جانب سمنٹ کا بنا ہوا چبوترہ ہے، جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے، اس چبوترہ پر ایک خیمہ کی شکل کا لکڑی کا ایک ڈھانچہ بنا ہوا ہے"، اسی لکڑی کے ڈھانچہ کو ڈسٹرکٹ

سب جج نے شاید مندر کہا ہے، ان کے فیصلہ کا سب سے اہم جزو یہ ہے: "وہ جگہ جہاں ہندو پوجا کرتے ہیں، قدیم زمانہ سے ان کے قبضہ میں ہے، اور ان کی ملکیت پر کوئی کلام نہیں ہو سکتا، اور اس کے گرد مسجد کی دیوار ہے، دیوار پر "اللہ" کا لفظ کندہ ہے، اگر ایسے مقام پر چبوترے پر کوئی مندر بنایا جاتا ہے تو جب ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایک ہی راستہ سے گذریں گے، مندر کی گھنٹیوں اور سنکھ کی آواز گونجے گی، اگر ہندوؤں کو مندر کی تعمیر کی اجازت دے دی جائے تو ایک نہ ایک دن کوئی ہنگامہ شروع ہو جائے گا، اور ہزاروں افراد ہلاک ہوں گے، نظم و قانون کے پامال ہونے کے اس سبب کے تحت نئی تعمیر سے روک دیا، لہٰذا یہ عدالت بھی معقول اور مناسب تصور کرتی ہے کہ اس مقام پر مندر کی تعمیر کی اجازت دینا فساد اور خوں ریزی کی بنیاد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ڈالنا ہے، جو دو مختلف مذہبوں کے ماننے والے ہیں، لہٰذا جو دادرسی چاہی گئی ہے وہ بہ تقاضائے انصاف منظور نہیں کی جانی چاہیے، قانون اقرار عہد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عدالت اس امر واقع سے واقف ہے کہ کسی بھی فریق کو اقرار عہد کی ہدایت نہیں دی جانی چاہیے، ان اسباب کے تحت جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، مدعی کی جانب سے جو ریلیف طلب کی گئی ہے، وہ قانون کے مطابق نہیں ہے۔"

اس فیصلہ کے مطابق بابری مسجد کو بالکل ایک مسجد کی حیثیت دے دی گئی، مگر اس کے خلاف مہنتوں نے جو اپیل کی، اس میں بھی مسجد پر قبضہ کرنے کا دعویٰ نہیں کیا گیا، بلکہ چبوترہ پر مندر بنانے کا اصرار کیا گیا۔

فیصلہ کے خلاف اپیل اور اس کی نامنظوری

مہنتوں کی یہ اپیل فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں ہوئی، جو اس وقت ایک انگریز تھا، اس نے جو اس اپیل پر فیصلہ دیا، وہ بھی ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

۱۱۔ ڈسٹرکٹ جج فیض آباد، کرنل ایف۔ ای۔ اے۔ چیمپیر

کا فیصلہ بسلسلۂ سول اپیل نمبر ۲۷، ۱۸۸۵ء۔

مہنت رگھوبیر داس مدعی بنام سکریٹری آف اسٹیٹ آف انڈیا

محمد اصغر ۔ مدعیٰ علیہ

میں نے گذشتہ روز جملہ فریقوں کی موجودگی میں متنازع اراضی کا معاینہ کیا، میں نے دیکھا کہ بادشاہ بابر کی تعمیر کردہ مسجد شہر اجودھیا کی سرحد پر واقع ہے یعنی مغرب اور جنوب میں جس کے قریب مکانات نہیں ہیں، یہ بات افسوسناک ہے کہ ایک مسجد ایک ایسی زمین پر بنائی گئی جو ہندوؤں کے نزدیک خاص تقدس رکھتی ہے، لیکن چونکہ یہ واقعہ آج سے ۳۵۶ سال قبل پیش آیا ہے، لہٰذا اب یہ موقع نہیں ہے کہ اس کا تدارک کیا جا سکے، جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ جملہ فریقان حالت موجودہ کو برقرار رکھیں، اس طرح کے معاملہ میں جیسا کہ یہ ہے کہ کوئی بھی نیا اضافہ کسی فائدے کے بجائے کہیں زیادہ نقصان اور نظم کی ابتری کا باعث بنے گا۔

احاطہ میں داخلہ ایک پھاٹک کے راستے سے ہے جس پر "اللہ" کا لفظ لکھا ہوا ہے اور ٹھیک بائیں جانب سمنٹ کا بنا ہوا چبوترہ ہے، جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے، اس چبوترے پر ایک خیمہ کی شکل کا لکڑی کا ایک ڈھانچہ بنا ہوا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ یہ چبوترہ رام چندر جی کی جائے پیدائش ہے، دروازہ کے سامنے مسجد کے پختہ چبوترے کی طرف داخلہ کا راستہ ہے، ایک باڑ دار دیوار مسجد کے چبوترے کو اس احاطہ سے الگ کرتی ہے، جس پر چبوترہ واقع ہے۔

سب جج کے الفاظ ہیں: "باہر کے درجہ کی اراضی مع چبوترہ مقبوضہ مدعی اور ہندو لوگوں کی ہے، جو اس مقام پر ہندو پرستش کرتے ہیں، قدیم قبضہ ان کا ہے، جس میں ملکیت

ان کی میں کلام نہیں ہو سکتا ہے۔" یہ الفاظ غیر ضروری ہیں اور انھیں فیصلہ سے نکال دینا چاہیے، واحد سوال جو اس فیصلہ میں طے کیا گیا ہے یہ کہ متعلقہ فریقوں کی موجودہ پوزیشن برقرار رکھی جائے، اس مقدمہ کے اصل مدعا کی وضاحت کل بی بگرل نے کی، جبکہ ہم لوگ مسجد کے پاس کھڑے تھے، یعنی یہ کہ کسی اور حمایت اور جانب داری سے کام نہ لینے والی حکومت کی حیثیت سے برطانوی حکومت سے اس کی عدالتوں کے واسطے سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ ایک مسلم بادشاہ کے ذریعہ کی گئی ناانصافی کا تدارک کرے، ڈپٹی کمشنر کا موقف یہ ہے کہ اس معاملہ میں سول کورٹ کو اختیار سماعت نہیں ہے، اس کے تحت جو دادرسی چاہی گئی ہے، وہ ۱۸۶۱ء کے ایکٹ ۲۵ کی دفعہ ۵۶ کلاز (ڈی) کے خلاف ہے، میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ۱۳ مئی ۱۸۸۵ء کے آرڈر کے بارے میں کس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکومت ہند یا لوکل گورنمنٹ کے کسی محکمہ کے عوامی فرائض کی انجام دہی کے تعلق سے جاری کیا گیا ہے، اس کے برعکس مدعی کا بیان یہ ہے کہ لوکل گورنمنٹ نے اس کی درخواست کا کوئی جواب اسے نہیں بھیجا، اگر یہ کہا جائے کہ ۱۵ مئی ۱۸۸۵ء کا آرڈر کسی مجسٹریٹ کے ذریعہ جاری کیا گیا تھا، تو ضابطۂ فوجداری کی اس دفعہ کا حوالہ دیا جانا چاہیے جس کے تحت وہ آرڈر جاری کیا گیا تھا،

V.I.L.R.MED کے صفحہ ۳۸۴ پر یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ افراد کو خواہ ان کا تعلق کسی بھی گروہ سے ہو، عمارتیں بنانے اور ان میں عام پرستش کرنے کی آزادی ہے، بشرطیکہ وہ نہ تو اپنے دوسرے پڑوسیوں کو حاصل جائیداد اور ملکیت کے حق میں دخل انداز ہوں، اور نہ وہ اس کے ذریعہ عوامی دشواری اور پریشانی وغیرہ کا باعث بنیں، نیز بشرطیکہ یہ کام ان ہدایات کے مطابق ہو جو مجسٹریٹوں کی جانب سے عام راستوں میں رکاوٹ یا امن عامہ میں خلل اندازی کو روکنے کے لیے قانوناً جائز طریقہ پر جاری کی جائیں، اگر ایک کام کو حکومت کے ذریعہ کیا گیا کام سمجھا جائے

اور یہ کہ اس کام کے اس حصہ میں جو ڈپٹی کمشنر نے انجام دیا ہے، اس نے محض ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے پوری نیک نیتی کے ساتھ اپنے فرایض کی انجام دہی کے طور پر کام کیا ہے تو اگر ڈپٹی کمشنر کا اقدام بجائے خود مدعی کے خلاف غلط ہو، اور اس سے نقصان پہونچے، تو مدعی کو اس کی تلافی کی صورت، اس کام کے انجام دینے کے خلاف چارہ جوئی کے ذریعہ حاصل ہونی چاہیے، خواہ وہ کام اس کے انجام دینے والے نے اپنی طرف سے کیا ہو، یا بالاتر قوت کے حکم کے تحت انجام دیا ہو۔

وکل گورنمنٹ کی شہری ذمہ داری وجواب دہی کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا، اگر اس کے نمایندے کسی مجرمانہ حرکت کے لیے جواب دہ نہ ہوں، اس مقدمہ کے خارج کیے جانے کا سبب یہ ہے کہ کوئی ایسی بنیاد موجود نہیں ہے جو مدعی کو چارہ جوئی کا حق دے سکے۔

سول کورٹ کے اختیار سماعت کے محدود ہونے کے بارے میں جن فیصلوں تک میں پہونچا ہوں ان کا تعلق عوامی حق کے مسئلہ سے ہے، جس کا تعین کسی مجسٹریٹ نے کیا ہو، مثال کے طور پر ایک سول کورٹ کسی مجسٹریٹ کے جاری کردہ ایک آرڈر کو جس میں ایک سڑک کو عام سڑک قرار دیا گیا ہو، کالعدم کرنے کے مقدمہ کی سماعت نہیں کر سکتا،

یہ اپیل خارج ہو گئی، چونکہ مجوزہ مدعی علیہ نے اس مقدمہ میں اپنی مرضی سے مداخلت کی ہے، لہٰذا اس کے اخراجات کا، عدالتی فیس اور نقول کے اخراج کی حد تک مدعی کے ذریعہ ادا کیے جائیں گے۔

سرکاری وکیل کو ہر ایک عدالت میں ۱۶ سو کے روپیے کے اخراجات کی ادائیگی کی اجازت دی جاتی ہے۔ (دستخط ایف۔ ای۔ چیپر ڈسٹرکٹ جج)

(بشکریہ مسلم انڈیا اردو، مئی ۱۹۸۶ء)

تبصرہ | اس فیصلہ سے ظاہر ہے کہ انگریز ڈسٹرکٹ جج نے اپیل نامنظور کر دی، مگر اس کو خارج کرنے میں اپنی سامراجیت کا بھی مظاہرہ کیا، وہ سمجھتا تھا کہ اگر یہ جھگڑا ختم ہو گیا تو پھر سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا، اس لیے اس نے پہلے تو یہ لکھا کہ :

"میں نے گذشتہ روز فریقوں کی موجودگی میں متنازعہ فیہ اراضی کا معاینہ کیا، میں نے دیکھا کہ بادشاہ بابر کی تعمیر کردہ مسجد شہر اجودھیا کی سرحد پر واقع ہے، یعنی مغرب اور جنوب میں جس کے قریب مکانات نہیں ہیں۔"

یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ اس کے قریب مکانات نہیں تھے، اور یہ کون ثابت کرے کہ جس زمانہ میں یہ مسجد بنی اس زمانہ میں بھی مکانات نہ تھے، یہ بات صرف اس لیے لکھی گئی ہے کہ ہندوؤں کو یقین دلایا جائے کہ اس ویرانہ میں محض رام جنم بھومی کو مسمار کرنے کی خاطر یہ مسجد بنائی گئی، اور جب وہ ویران جگہ تھی تو پھر جنم استھان مندر وہاں پر کیسے تھا۔ اس کے بعد جو حسب ذیل تحریر ہے وہ ایک مقدمہ میں لکھنے کی ضرورت نہ تھی :

"یہ بات افسوسناک ہے کہ ایک مسجد ایک ایسی زمین پر بنائی جائے جو ہندوؤں کے نزدیک خاص تقدس رکھتی ہے۔"

جو بات پہلے انگریزوں نے قیاساً لکھی تھی، اس کو یہاں پر پورے وثوق کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس سے شر انگیزی ہی تو مراد تھی، جھگڑے کو برقرار رکھنے کی خاطر یہ بھی تحریر کیا گیا :

"لیکن یہ واقعہ آج سے ۳۵۶ سال قبل پیش آیا، لہٰذا اب اس کا موقع نہیں کہ اس کا تدارک کیا جا سکے، جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ جملہ فریقین حالت موجودہ کو برقرار رکھیں، اس طرح کے معاملہ میں جیسا کہ یہ ہے کوئی بھی نیا اضافہ کسی فائدے کے لیے کیا گیا تو کہیں زیادہ نقصان اور نظم کی ابتری کا باعث نہ بن جائے۔"

فیض آباد کے ڈسٹرکٹ سب جج کے فیصلہ کے ایک ٹکڑے کا یہ حوالہ دیا گیا :

"باہر کے دروازے کی اراضی مع چبوترہ مقبوضہ مدعی اور ہندو لوگوں کی ہے جو اس مقام پر ہندو پرستش کرتے ہیں، قدیم قبضہ ان ہی کا ہے، ان کی ملکیت میں کوئی کلام نہیں۔"

اس کے متعلق انگریز ڈسٹرکٹ جج نے یہ لکھا :

"یہ الفاظ غیر ضروری ہیں، انھیں فیصلہ سے نکال دیا جائے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ ڈسٹرکٹ جج نے مسلمانوں کو بھی اکسایا کہ وہ چبوترے کو ہندوؤں کی ملکیت قرار نہ دیں۔

رام جنم استھان کا چبوترہ | یہ چبوترہ کب بنا، اس کی صحیح تاریخ کسی مستند تاریخ سے نہیں بتائی جا سکتی ہے، پائنیر اخبار لکھنؤ مورخہ ۱۰ / ۱۱ / جنوری ۱۹۸۶ء میں اس کے ایک کالم نگار نے لکھا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ہندو اس جگہ پر بیس مرتبہ حملہ آور ہوئے تو اس نے راجہ ٹوڈرمل اور بیربل کو اجودھیا بھیجا، دونوں نے وہاں کے مہنتوں سے گفت گو کی، اور اس پر سمجھوتہ ہوا کہ مسجد کے بائیں جانب ایک چبوترہ رام مندر کے نام سے بنا دیا جائے، تاکہ ہندو وہاں آکر پوجا اور درشن کر سکیں، کالم نگار نے اس کا حوالہ اکبر کے زمانہ کی ایک کتاب دیوان اکبری کا دیا ہے، ایسی کوئی کتاب اس زمانہ میں نہیں لکھی گئی، اور اگر اس سے مراد آئین اکبری ہے، تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایسی کوئی روایت نہیں، یہ محض من گھڑت واقعہ ہے، اگر آئین اکبری میں ایسی کوئی بات لکھی ہوتی تو انگریز مورخین اور اہل قلم اس سے پورا فائدہ اٹھا کر اس فتنہ کو آگے بڑھاتے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ نواب واجد علی شاہ کے زمانہ میں انگریزوں نے ایک بدھسٹ نجومی کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ ایک زائچہ کے ذریعہ سے جنم استھان اور

سیتا رسوئی گھر کو بابری مسجد کے اندر دکھائے، اور ہندو ان جگہوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں

واجد علی شاہ کا وزیر نقی علی خان انگریزوں کا ایجنٹ تھا، اس نے واجد علی شاہ کو اس پر راضی

کرلیا، کہ حدود مسجد سے باہر رام جنم استھان اور سیتا رسوئی گھر کے لیے جگہ دے دی جائے،

چنانچہ مسجد کے مسقف حصہ کے بالمقابل دائیں سمت احاطہ سے متصل سیتا رسوئی کے لیے

اور صحن مسجد سے باہر بائیں پورب کی طرف جنم استھان کے طور پر ۲۱ فٹ لمبی اور ۱۷ انٹ

چوڑی جگہ دے دی گئی، جس پر ایک بالشت چبوترہ بنانے کی اجازت تھی، اس موقع پر مسجد

کے صحن کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دیا گیا جو اب تک کھلا ہوا تھا، (مجلہ دارالعلوم دیوبند،

مارچ، اپریل سنہ ۱۹۸۶ء)

یہ روایت کسی مستند معاصر تاریخ میں نظر سے نہیں گذری، اگر مسجد کو لوہے کی سلاخوں سے

گھیر دینے کی روایت تو قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۱۲ میں ہے، اور اسی کے مطالعہ سے معلوم

ہوتا ہے کہ یہ مسجد سیتا رسوئی گھر کے پاس بنی اور جمہور اس کو سیتا رسوئی کی مسجد بھی کہتے تھے، (ج ۲

ص ۱۱۷) مگر یہ بات ذرا مشکوک ہے کہ واجد علی شاہ نے مسجد کے باہر چبوترہ بنانے کی اجازت

دی، کیونکہ ۱۸۵۸ء میں بابری مسجد کے خطیب اور موذن کی طرف سے جو مقدمہ دائر ہوا ہے

اس کی درخواست میں درج ہے کہ مقام جنم استھان صدہا برس سے پریشان یعنی خالی پڑا رہتا

تھا، اور وہیں ہندو آکر پوجا کرتے تھے، مگر انھوں نے "شبا شب" ایک چبوترہ تھانیدار کی

سازش سے بنالیا، تو اس کو منہدم کر دینے کی درخواست دی گئی، لیکن یہ منہدم نہیں کیا گیا،

ہنت امتناعی حکم کے باوجود اس میں کچھ نہ کچھ اضافے کرتے رہے۔

۱۸۵۸ء کے مقدمہ کے فیصلہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں

خاموش ہو گئے، اور بابری مسجد کے لیے کوئی مزید جھگڑا نہیں ہوا، مسلمان اس میں نماز یں

ادا کرتے رہے، جس کے معنی یہ تھے کہ ہندوؤں نے بھی تسلیم کر لیا کہ یہ مسجد ہے، اس میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کا حق ہے، مگر انگریز اس تنازع کو زندہ رکھنا چاہتے تھے، اس لیے اپنی کسی نہ کسی تحریر میں ہندوؤں کو یہ لکھ کر مشتعل کرتے رہے کہ بابری مسجد رام جنم بھومی کی جگہ پر بنائی گئی، جس کی ایک مثال ۱۹۰۵ء کا فیض آباد گزیٹیر ہے۔

۱۹۰۵ء کا فیض آباد گزیٹیر ۱۹۰۵ء میں ایچ۔ آر۔ نیویل نے فیض آباد گزیٹیر مرتب کیا تو پہلے اس کے ص ۱۵۳ پر یہ لکھا:

"۱۵۲۸ء میں بابر نے اس روایتی جگہ پر اجودھیا میں مسجد بنائی جہاں رام پیدا ہوئے تھے"

پھر اس کے صفحہ ۱۷۲ پر یہ تحریر کیا:

"ساتویں صدی سے ایک طویل مدت کے لیے یہ جگہ یعنی اجودھیا تقریباً ویران ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اگرچہ مسلمانوں کے عہد میں اس کی اہمیت پھر ہو گئی کیونکہ انھوں نے اس کو ایک بڑے صوبہ کی راجدھانی بنایا، لیکن ہندو اس کو مقدس جگہ سمجھتے رہے، یہ بات اس سے ظاہر ہے کہ بابر اور اورنگزیب نے اس کی بے حرمتی کی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمان حاکم کی موجودگی اور اس کے دربار کی وجہ سے ہندوؤں کی مقدس جگہیں پس پشت پڑ گئیں۔"

پھر وہ ص ۱۷۳-۱۷۴ پر یہ لکھتا ہے:

"یہ زبانی روایت سے یقین کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے زمانہ میں اجودھیا میں تین اہم ہندو عبادت گاہیں تھیں، چھوٹی چھوٹی بھی رہیں، یہ تین جگہیں رام جنم استھان مندر، سورگ دوار اور تریتا کا ٹھاکر تھیں، ان میں سے ہر ایک پر مختلف مسلمان حکمرانوں کی نظر رہی، جنم استھان رام کوٹ میں تھا، یہ رام کی پیدائش کی جگہ بتائی جاتی ہے، ۱۵۲۸ء میں بابر اجودھیا آیا، اور یہاں ایک ہفتہ ٹھہرا، اسی نے یہاں ایک پرانے مندر کو منہدم کیا اور اس کی جائے وقوع پر

ایک مسجد بنائی، جو بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے، اس میں پرانی عمارت کے زیادہ تر سامان لگائے گئے، اس کے بہت سے ستون اچھی حالت میں ہیں، وہ Close grained کالے پتھر ہیں، جن کو وہاں کے لوگ کسوٹی کہتے ہیں، ان پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، ان کی لمبائی سات سے آٹھ فٹ تک ہے، نیچے بیچ اور کیپٹل میں چوکور ہے، بقیہ حصہ یا تو گول یا ہشت پہل ہے، مسجد میں دو کتبے ہیں، ایک تو باہر سے جواب تک دیکھا جاسکتا ہے، اور دوسرا منبر کے پاس ہے، دونوں کتبات فارسی میں ہیں، ان میں ۹۳۵ھ درج ہے، ان کتبات کے مستند ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا کوئی ذکر نہیں، یہ واقعہ تقریباً اس وقت کا ہے جب وہ اپنی فوج لے کر بہار کی مہم پر جارہا تھا۔

اس شہر کی مقدس ترین جگہ کی بے حرمتی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑی تلخی رہی، کئی موقع پر مسلمانوں نے زبردستی جنم استھان پر قبضہ کرلیا جس کے بعد انھوں نے ہنومان گڑھی پر زبردست حملے کیے، وہ اس کے زینے تک پہونچ گئے، لیکن وہ کافی نقصان کے ساتھ پیچھے ڈھکیل دیے گئے، پھر ہندوؤں نے جوابی حملہ کیا اور جنم استھان پر قبضہ کرلیا جس کے پھاٹک پر پچھتر مسلمان مارے گئے، اور جہاں دفن کیے گئے، وہ گنج شہیداں کہلایا، شاہ (اودھ) کی فوج کے کئی دستے اس وقت موجود تھے، لیکن ان کو مداخلت کرنے کا حکم نہ تھا، اس کے کچھ دنوں کے بعد امیٹھی کے امیر علی نے لکھنؤ میں باضابطہ حملہ کی تنظیم کی، تاکہ وہ ہنومان گڑھی کو برباد کردیں، لیکن ان کو اور ان کی فوج کو بارہ بنکی میں روکا گیا، یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اسی عمارت میں عبادت اور پوجا کیا کرتے تھے، لیکن غدر کے بعد سے مسجد کے باہر ایک بیرونی احاطہ بنادیا گیا، اور ان کو اندرونی احاطہ میں جانے سے منع کردیا گیا، اور ان سے اس چبوترہ پر پوجا کرنے کو کہا گیا، جو انھوں نے بیرونی احاطہ میں بنالیا تھا۔"

تبصرہ | ایچ. آر. نیویل نے اپنے اس گزیٹیر میں وہی باتیں دہرائی ہیں جو سنہ ۱۸۸۰ء میں سٹلمنٹ افسر کی رپورٹ اور سنہ ۱۸۷۷ء کے گزیٹیر میں لکھی گئی تھیں، سطروں کی سطریں بجنسہ ان سے لے لی گئی ہیں، البتہ ان میں جو بعض باتیں قیاساً کہی گئی تھیں، نیویل نے ان کو پورے وثوق کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے، وہ یہ لکھتا ہے کہ سنہ ۱۵۲۸ء میں بابر نے اس مقدس جگہ پر اجودھیا میں مسجد بنائی، جہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے، پھر یہ بھی لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر نہیں، شاید اس کو اپنی ان متضاد تحریروں کا احساس نہیں رہا، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "ساتویں صدی سے ایک مدت کے لیے اجودھیا ویران رہا، معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اس کی اہمیت پھر ہو گئی کیونکہ انھوں نے اس کو ایک بڑے صوبہ کی راجدھانی بنائی" اس سے تو یہ ظاہر ہے کہ ساتویں صدی کے بعد ہندو اس شہر کو مقدس نہیں سمجھتے تھے، اس لیے یہ ویران ہوتا چلا گیا، لیکن نیویل کو خیال ہوا کہ اگر اس کو مقدس جگہ قرار نہ دیا جائے گا تو پھر اس کی تصنیف کا سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا، اس لیے وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ہندو اس کو مقدس جگہ سمجھتے رہے، اور اس کی کیا خوب وجہ بتائی ہے کہ وہ اس کو مقدس سمجھتے تھے اس لیے بابر اور اورنگزیب نے اس کی بے حرمتی کی، اور پھر وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہاں مسلمان حاکم کی موجودگی اور اس کے دربار کی وجہ سے ہندوؤں کی مقدس جگہیں پس پشت پڑ گئیں، یہ جگہ سنہ ۱۲۰۵ء کے بعد ہی سے مسلمانوں کے زیرنگیں آگئی تھی، تو پھر اس کے بعد ہی سے ہندوؤں نے یہاں کی مقدس جگہوں کو پس پشت ڈال دیا تھا، اس کے تو یہ معنی ہیں کہ انگریزوں ہی نے اس جگہ کے تقدس کا احساس ان کو دلایا، تاکہ وہ یہاں کی مسجدوں اور مندروں کو تنازعہ شروع کریں، وہ اجودھیا کے تین مندروں یعنی رام جنم استھان، سورگ دوار، اور

تریتا کا ٹھاکر کے وجود کا ذکر محض زبانی روایتوں کے سہارے کرتا ہے، مگر اس نے زبانی روایتیں بھی حاصل کرنے کی خود تکلیف گوارا نہیں کی، بلکہ ۱۸۷۰ء میں کارنیگی کی رپورٹ اور ۱۸۷۷ء کے گزیٹیر میں جو کچھ لکھا گیا تھا، اسی کو دُہرادیا ہے، مگر ان باتوں کو دُہرانے میں اس کے بیان میں اختلاف ہے، ۱۸۵۵ء کے جھگڑے کے سلسلہ میں ۱۸۷۷ء کے گزیٹیر میں ہے کہ ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کرلیا، مسلمان اس موقع پر ہنومان گڑھی کے زینہ تک پہونچ گئے۔

نیویل نے اپنے گزیٹیر میں لکھا ہے کہ:

"مسلمانوں نے زبردستی جنم استھان پر قبضہ کرلیا، جس کے بعد انھوں نے ہنومان گڑھی پر زبردست حملے کیے۔"

اس کو فروعی اختلاف کہا جا سکتا ہے، لیکن جب نیویل یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے جنم استھان پر زبردستی قبضہ کرلیا تو یہ جنم استھان کون سا تھا؟ کارنیگی اور ۱۸۷۷ء کے گزیٹیر کے مرتب ہندوؤں کو خوش کرنے اور ان کو ورغلانے کے لیے بابری مسجد کو جنم استھان ہی کہتے ہیں، نیویل نے بھی ہندوؤں کو اپنی تحریر میں خوش کرنے کے لیے بابری مسجد کو جنم استھان کہا ہے، اس پر زبردستی قبضہ کرنے کے کیا معنی؟ مسلمانوں کی مسجد تھی، اسی لیے شاہ غلام حسین اور مولوی امیر علی نے اسی مسجد کو اپنا مورچہ بنایا، اور اسی کے اندر اور باہر مقابلہ کرکے جاں بحق ہوئے، اس گزیٹیر میں وہ جھوٹ بھی دُہرایا گیا ہے جو کارنیگی نے اپنی ۱۸۷۰ء کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ شاہ کی فوج کے دستے نے کوئی مداخلت نہیں کی، اور ہندو اور مسلمان دونوں مسجد میں پوجا اور عبادت کرتے آئے تھے

مسز اے۔ اس۔ بیورج کی شرانگیزی | مسز اے اس۔ بیورج نے انگریزی میں تزک بابری کا ترجمہ انگریزی میں کر کے اس کو بابر نامہ کے نام سے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ اس میں تعلیقات اور حواشی بہت ہی محنت سے لکھے۔ مگر بابری مسجد کے سلسلہ میں اپنی سامراجی قوم کی ہم نوائی کی اس کو بابر نامہ یا مغلوں کے عہد کی کسی تاریخ سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بابر نے رام جنم استھان کو مسمار کر کے ایک مسجد بنائی تو اس نے پہلے بابر نامہ کے صفحہ ۵۶ پر ۱۹۰۵ء کے گزیٹیر کے مرتب ایچ۔ آر۔ نیوبل کا بیان نقل کیا۔ حالانکہ اس کی تحقیق اور دانشوری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ یہ کس معتبر تاریخی ماخذ کے حوالے سے لکھا گیا ہے، اس سے یہ توقع نہ تھی کہ گزیٹیر کی ایک سنی سنائی روایت کو تاریخی سند قرار دینے کی کوشش کرے گی، اپنی کتاب کے ضمیمہ یو میں بابری مسجد کے کتبات نقل کئے ہیں ان اشعار کو نقل کر کے ان کی لفظی خوبیوں پر تبصرہ بھی کیا ہے جس میں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ مسجد جنم استھان بھومی کی جگہ پر بنائی گئی، اس کا ضمیر صاف نہ تھا، اس لیے اپنی کتاب کے صفحہ ۷۱ × × × ۱ پر نظر سے چوک جانے والے خفی حروف میں لکھ گئی ہے۔

Presumably the order of the mosque was given during Babur's stay in Aud (Ajodhaya) in 934 A. H. at which time he would be impressed by the dignity and sanctity of the ancient Hindu shrine it (at least in part) displaced (?) and like the obedient follower of Muhammad he was in intolerance of Faith would regard the substitution of a temple by mosque as

dutiful and worthy. The mosque was founded [in 935 A. H. but no mention of its completion is made in Baburnama. The Diary for 935 A. H. has many minor lacunae, that of the year 934 A. H. has lost much matter breakig off when the account of Aud. might be looked (P LXXVI)

ہم نے یہ انگریزی عبارت یہاں پر قصداً نقل کی ہے، تاکہ اس سامراجی قوم کی ذہنیت ظاہر ہو، جو اردو ترجمہ میں نہ ہوتی، اس گنجلک اور پرپیچ عبارت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سب قیاسات پر مبنی ہے تحقیق پر نہیں، اس سلسلہ میں اس نے اپنا مورخانہ نقد و تبصرہ چھوڑ کر اپنی قوم کی سامراجی ذہنیت سے کام لیا ہے، اور یہ کل تحریر (Presumably) (قیاساً) کے لفظ سے شروع ہوتی ہے، جس کے بعد پوری عبارت مجروح ہو جاتی ہے۔ بابر کے اجودھیا آنے کا مستند ثبوت نہ تھا، تو (Presumably) لکھ کر اس کے اجودھیا آنے کا ذکر کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی قیاساً لکھا گیا ہے، کہ بابر یہاں کے ایک مندر یا کم از کم ایک حصہ کے رتبہ اور تقدس سے متاثر ہوا ہوگا۔ اور صریحاً متعصبانہ جھوٹ سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دیا کرتے تھے، بابر آپ کا ایک فرمانبردار پیرو بن کر عدم رواداری کیلیے اس نے خیال کیا، کہ ایک مندر کی جگہ پر ایک مسجد بنا کر اپنے کو ایک فرض شناس اور لائق پیرو ثابت کر دیگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تعلیم دوسروں کے مذہب اور عبادت گاہوں کے

متعلق تھی۔ اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، اس کے بعد مسز بیورج نے جو کچھ لکھا ہے اس کو شرانگیز جھوٹ کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی بات ۱۸۸۱ء کے گزیٹیر میں لکھی گئی تھی۔ مسز بیورج نے اسی کو دوسرے انداز میں دہرا دیا ہے۔

مسز بیورج اپنی قیاس آرائیوں سے کام لے کر یہ بھی لکھتی ہیں کہ یہ مسجد ۹۳۵ھ میں مکمل ہوئی، مگر بابر نامہ میں اس کی تکمیل کا ذکر نہیں۔ اس کے ذکر نہ ہونے کی تاویل اپنی قیاس آرائیوں سے اس طرح کی ہے کہ ڈائری میں ۹۳۵ھ کے بہت سے جزئی واقعات لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ ۹۳۴ھ کے تو ایسے بہت سے واقعات کھو گئے ہیں، جن سے اودھ کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتے تھے۔ ان قیاس آرائیوں کی صداقت تسلیم کرنے کی کوشش کو تحقیق و دانشوری نہیں کہا جا سکتا ہے، یہی باتیں کارنیگی کی رپوٹ اور ۱۸۸۱ء کے فیض آباد کے گزیٹیر میں کہی گئی ہیں، اسی سے متاثر ہو کر مسز بیورج یہ سب کچھ لکھ گئیں جو یقیناً ان کی دانشوری پر ایک بدنما داغ ہے۔

اودھ میں بابر کا قیام | بابر نے اپنے اودھ آنے کا جو ذکر کیا ہے، وہ مسز بیورج کے ترجمہ بابر نامہ میں موجود ہے، اس کی ترتیب عیسوی سنہ کے مطابق اس طرح کی گئی ہے۔

۱۳ جون ۱۵۲۸ء گومتی عبور کر کے دن رات چلنے کے بعد ہم لوگ دلمؤ پہنچے جہاں گنگا کے گھاٹ سے ہماری فوج پار اتری، اور جب ہم اپنے لشکر کو لیکر پہنچے تو گھاٹ کے نیچے معجون کھائی۔

۱۰ جون دریا عبور کر کے ہم نے ایک دن انتظار کیا، (دوشنبہ ۶ شوال) تاکہ پوری فوج پار ہو جائے۔ آج باقی تاشکندی اودھ کی فوج لے کر آیا اور اس نے باریابی حاصل کی۔

۱۴ جون گنگا کو چھوڑ کر (آٹھویں تاریخ بروز منگل) ایک رات منزل کر کے ہم لوگ ۱۵ جون (۹ شوال) کو کوراره کے پاس ارند ندی کے کنارے پر اترے۔ دلمؤ سے کوراره بائیس کوس (۴۴ میل) ہے۔

۱۴/جون، جمعرات کو اس مقام سے اندھیرے میں کوچ کیا، اور پرگنہ آدم پور کے مخالف میں اترے۔ ۸/جون (جمنا) کو پار کر کے دشمنوں کا تعاقب کرنے کے خیال سے چند ملاحوں کو آگے روانہ کر دیا تھا۔ تاکہ کالپی میں جتنی کشتیاں ملیں حاصل کریں۔ کچھ کشتیاں اس رات پہنچیں جب ہم وہاں اترے، جمنا ہی کے ذریعہ ایک گھاٹ مل گیا جہاں لشکر کا پڑاؤ ہونے والا تھا۔ وہ گرد و غبار سے بھرا تھا، اس لیے ہم لوگ ایک جزیرہ میں ٹھہر گئے۔ اور وہاں کئی روز قیام رہا، دشمنوں کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ اس نے باقی شقاول کو کچھ جوانوں کے ساتھ ان کی خبریں لانے کے لیے روانہ کیا۔

۱۷/جون دوسرے دن (۱۱/تاریخ بروز جمعہ) ظہر کے وقت باقی آیا، باقی کا ایک فوجی آیا اور خبر لایا، کہ باقی نے بین اور بایزید کے لشکریوں کو شکست دیدی ہے۔ اور ان کے ایک عمدہ آدمی مبارک خاں جلوانی اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگوں کو قتل کر ڈالا ہے۔ کچھ کٹے ہوئے سر اور ایک زندہ آدمی کو بھی بھیجا ہے۔

۸/جون صبح کو (۱۲/تاریخ بروز شنبہ) بخشی شاہ حسین آیا۔ اور اس نے دشمن کے لشکریوں کی شکست کا حال سنایا۔ اور دوسری مختلف خبریں دیں۔ اسی رات یعنی سنیچر کی رات تیرہویں تاریخ جمنا میں سیلاب آگیا، صبح تک اس پورے جزیرہ میں جس میں ہم لوگ ٹھہرے تھے، پانی بھر گیا، ایک تیر کے فاصلہ پر ہم لوگ دریا کے نیچے چلے گئے۔ اور وہاں ایک خیمہ ڈال کر مقیم ہوئے۔

۲۰/جون، دوشنبہ کو جلال تاشکندی ان امراء اور سلاطین کے پاس سے آیا، جو آگے بھیجے گئے تھے، اس سے معلوم ہوا، کہ چغتائی کی خبر سن کر شیخ بایزید اور بین پرگنہ کی طرف بھاگ گئے۔ ادھر برسات سر پر آگئی۔ ادھر پانچ چھ مہینے سے جو فوج کشی ہو رہی تھی، تو گھوڑے اور دوسرے جانور تھک چلے تھے، اس نے سلاطین اور امراء کو حکم دیا۔ کہ وہ وہیں ٹھہرے رہیں، جہاں وہ ہیں۔

یہاں تک کہ آگرہ اور دوسرے مقامات سے تازہ ساز و سامان آجائے، اسی دن عصر کے وقت باقی اور اس کے ساتھ اودھ کی فوج کو رخصت کر کے روانہ کیا۔ موسیٰ بن معروف فرلی دریائے سرو چھوڑتے وقت حاضر ہوا تھا، اس کو امروہہ کے علاقہ کی تیس لاکھ جاگیر اس کی تنخواہ میں دی، اور اس کو ایک خاص خلعت اور گھوڑا دے کر امروہہ جانے کی رخصت عطا کی۔

اور جون جب ادھر سے خاطر جمع کر لی تو منگل کی رات تین پہر ایک گھڑی گذرنے کے بعد ہم چل کھڑے ہوئے۔ کالپی کے پرگنہ بلادر میں دوپہر کو ذرہ دم لیا۔ اور گھوڑے کو دانہ گھاس کھلا کر مغرب کے وقت سوار ہو گئے۔ رات کو تیرہ کوس چل کر رات کا تیسرا پہر تھا۔ کالپی کے پرگنہ سوگند پور میں پہنچے، اور بہادر خاں سروانی کے مقبرہ میں اتر کر سو رہے۔ فجر کی نماز کے وقت وہاں سے کوچ کیا، سولہ کوس کا راستہ طے کر کے دوپہر کو اٹاوہ پہنچ گئے، جہاں مہدی خواجہ نے پیشوائی کی۔ (صفحہ ۸۲ - ۶۸۴)

اوپر کے اقتباس سے تو ظاہر ہے، کہ وہ اودھ کے امراء کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے آیا، وہ ایک مندر کو مسمار کر کے ہندوؤں کو اپنے سے خواہ مخواہ کیوں بدظن کرتا۔ وہ اس سفر میں باقی تاشکندی سے اس کی فوج کے ساتھ ملا جو اودھ سے آیا تھا۔ باقی کے نام کے ساتھ اس نے تاشکندی اور شقاول لکھا ہے، گو اس کے نام کے ساتھ کتبہ میں اصفہانی لکھا ہے، جب بابر اس سے ملا تو وہ اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ اس نے ایک مندر کو توڑ کر مسجد کی تعمیر کس حد تک کی۔

انگریزوں کی شر انگیزی کا تجزیہ

کارنیگی ۱۸۷۰ء کے فیض آباد گزیٹیر کے مرتب . . . ڈبلیو ڈبلو ہنٹر، مسٹر نول اور مسٹر بوریج کے اس قسم کے شر انگیز بیانات کا تجزیہ کرنے کی کچھ اور ضرورت ہے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ انگریز اپنی سامراجیت میں ہندو مسلمان میں باہمی نفرت پیدا کرانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس کی تائید اڈیسہ کے موجودہ

گورنر بی، این پانڈے کی اس تقریر سے بھی ہوتی ہے۔ جو انھوں نے راجیہ سبھا میں ۹ ۲ جولائی ۱۹ء
میں کی تھی، انھوں نے اس میں بتایا کہ ہندوستان میں انگریز مورخوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں
اس پر زیادہ زور دیا کہ ہندو مسلمان کس طرح ایک دوسرے کے خلاف تشدد آمیز رویہ
اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے علاقے کو فتح کرتے اور لوٹ مار کے ذریعہ مذہبی تعصب
دکھلاتے، ان تاریخوں میں یہ بھی دکھایا گیا ہے، کہ مسلمان ہندوؤں کے کلچر اور روایت کو تہس نہس
کرنے میں مشغول رہے، ان کے مندروں اور محلوں کا انہدام کیا، ان کی مورتیاں توڑ ڈالیں۔
ان کے سامنے یہ شرط پیش کرتے رہے کہ اسلام قبول کرو، ورنہ تلوار استعمال کیجائے گی۔

جناب بی این پانڈے نے اپنی تقریر میں یہ بھی بتایا کہ برطانوی حکومت کی سرکاری دستاویز
سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لارڈ ایلگن کے زمانہ میں سکریٹری آف سٹیٹ وڈ نے اس کو ایک خط مورخہ
۳ مارچ ۱۸۶۲ء میں لکھا کہ ہم لوگوں نے ہندوستان میں اب تک اپنا اقتدار اس طرح
قائم کر رکھا ہے، کہ ہم ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کا مخالف بناتے رہے، اس کو جاری رکھنا
چاہئے، جہاں تک ممکن ہو، اس کی پوری کوشش کرتے رہنا چاہئے کہ یہاں کے لوگوں میں
مشترکہ جذبات پیدا نہ ہونے پائیں۔

۹ مئی ۱۸۶۲ء میں اسی وڈ نے لارڈ ایلگن کو پھر لکھا کہ اس کو یقین جانیں کہ یہاں کے
لوگوں کی ایک دوسرے کی دشمنی ہمارے لیے قابل اعتنا ہوگی، اگر پورا ہندوستان ہمارے
خلاف متحد ہو جائے، تو ہم وہاں کیسے باقی رہ سکتے ہیں،

۹ مارچ ۱۸۸۷ء میں ایک دوسرے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج فرانسس ہملٹن نے
لارڈ کرزن کو لکھا کہ ہم لوگ ہندوستان کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر
دیں، اس طرح کہ دونوں کے خیالات مختلف ہوں، اس لیے تعلیمی اداروں میں نصاب کی

کتابیں ایسی پڑھائیں کہ یہاں کے مختلف فرقوں کے درمیان تفرقہ کی مضبوطی پیدا ہوتی رہے۔

۱۴ جنوری ۱۸۸۷ء میں اسی سکریٹری آف اسٹیٹ نے لارڈ ڈفرن کو لکھا کہ ہندوستان کو لوگوں میں مذہبی اختلاف پیدا کرنا ہمارے فائدہ کے لیے ہے۔ آپ نے ہندوستان میں تعلیم کے نصاب بنانے کے لیے جو تحقیقاتی کمیٹی بنائی ہے، اس سے ہم اچھے نتائج کے متوقع ہیں۔

برطانوی حکومت کی اس سیاسی حکمت عملی کی روشنی میں کارنیگی، ۱۹۰۵ء کے فیض آباد گزیٹیر کے مرتب ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ نیول اور مسز اے۔ ایس بیورج کی مذکورہ بالا تحریروں کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ ان ہی پر کیا منحصر ہے، ہندوستان کے آثار قدیمہ کے انگریز ماہرین، عام مورخین ضلع کے گزیٹیر کے مرتبین جب اور جہاں موقع ملا انھوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر کے یا اپنی دانشوری، یا اپنی قیاس آرائیوں اور دور از کار تاویلوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں پر بڑے مظالم کیے۔ ان کو برابر خوفناک ذلتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ان دونوں فرقوں میں کسی قسم کی مشترکہ قدریں نہیں ہیں۔

ہندوستان کے تمام لوگ انگریزوں کی فریب کارانہ حکمت عملی کو سمجھنے کے باوجود ان کے دام تزویر میں پھنستے رہے۔ ان کی سیاسی چالبازیوں سے تو چوکنا ضرور ہوئے، مگر ان کے علمی اور تحقیقی فریب کا جادو ان کے سر سے اتر تا گیا۔ بلکہ ان کے سروں پر چڑھ کر بولتا رہا۔

بابری مسجد کے لیے باضابطہ جاگیریں | ۱۸۸۵ء کے مقدمہ کے فیصلے کے بعد بابری مسجد پہلے کی طرح برابر مسلمانوں کے قبضہ میں رہی اور اجودھیا کے مسلمانوں کے بیان کے مطابق وہاں پنج وقتہ نماز بھی ہوتی رہی، اور جمعہ بھی ہوتا رہا۔ کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے امام اور موذن کے لیے مغلیہ عہد سے ساٹھ روپیہ سالانہ کی رقمیں مقرر تھیں، جو سرکاری خزانہ سے ملا کرتی تھیں، پھر یہ رقم بڑھا کر تین سو روپیہ، تین آنے، چھ پائی کر دی گئی۔ برطانوی حکومت کے زمانہ میں یہ رقم جاری رہی

پھر بندوبست اوّل کی رقم کے بجائے دو گانوں بھورن پور اور شولا پور متصل اجودھیا بطور معافی دیے گیے جن کی آمدنی برابر مسجد کے مصارف پر خرچ ہوتی رہی، چنانچہ رجسٹر ڈزیر دفعہ نمبر ۲۰ میں اس وقت کے متولی جواد حسین ساکن موضع شنواں، ڈاکخانہ درشن نگر، ضلع فیض آباد اور ان کے زیر انتظام جائداد بابری مسجد کی عمارت اور موضع بھورن پور اور شولا پور کی اراضی کی تفصیل درج ہے۔ اور پھر سنی وقف ایکٹ ۱۳ / ۱۹۲۰ کے تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے معاینہ کر کے اس کا رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا (بحوالہ رسالہ دارالعلوم دیوبند، مارچ و اپریل ۱۹۸۶ء)

۱۹۳۴ء کا جھگڑا | ۱۹۲۰ء کے بعد کچھ سال ایسے گزرے کہ ہندو مسلمان میں خلافت تحریک اور نان کو آپریشن موومنٹ کے سلسلہ میں بڑا میل ملاپ ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب دونوں بھائی بن کر ہمیشہ زندگی گذاریں گے، اور دونوں . . . . . واقعی ایک ہی قوم ہیں، مگر کچھ دنوں کے بعد سنگھٹن اور شدھی کی تحریکیں چلیں تو ہندو مسلمان دونوں میں بڑا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور بلوے فسادات جابجا ہونے لگے، اسی سلسلہ میں ۱۹۳۴ء میں بابری مسجد اور جنم استھان کا پھر جھگڑا کھڑا ہوا اور دونوں فرقوں کے درمیان بلوہ ہوا، تو جیسا کہ شروع میں ہوا تھا، اس موقع پر بھی فسادیوں نے بابری مسجد میں گھس کر توڑ پھوڑ کیا۔ بعض کتبے کو بھی اکھاڑ لے گئے، مسجد کے کچھ حصے کو نقصان بھی پہونچایا مگر حکومت کے خرچ سے اس کی مرمت کر دی گئی، اور پھر یو۔پی۔ مسلم ایکٹ ۱۹۳۶ء کے مطابق یہ مسجد یو۔پی سنی سنٹرل بورڈ وقف کے ماتحت رجسٹرڈ کر لی گئی، ۲۰ فروری ۱۹۴۴ء میں وقف کے کمشنر کی جو رپورٹ اس تاریخ کے گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں بھی یہ مسجد سنی وقف کی دکھائی گئی ہے۔

بابری مسجد کو مندر بنانے کی کوشش | ۱۹۴۹ء تک بابری مسجد کسی اختلاف اور نزاع کے بغیر مسلمانوں کے قبضہ میں رہی، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد جب قومی حکومت قائم ہوئی، اور ضرورت اس بات کی تھی

کہ قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے، تو اس کے برخلاف ۲۲،
۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات کو ہنومان گڑھی کے مہنت ابھے رام اپنے چیلوں کے ساتھ
مسجد کی دیوار پھاند کر اس میں گھس گئے۔ اور اس کے درمیانی گنبد میں عین محراب کے اندر رام
کی مورتی رکھ دی، اس وقت ماتو پرشاد ایک کانسٹبل وہاں متعین تھا، اس نے تھانہ میں رپورٹ
درج کرائی کہ ابھے رام داس، شکل داس، سدرشن داس اور پچاس ساٹھ نامعلوم آدمیوں نے
مسجد کے اندر جاکر مورتی رکھ دی ہے، جس سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

مسجد میں تالہ | اس رپورٹ پر فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت مسجد اور اس سے
ملحق گنج شہیداں کو قرق کر لیا، اور پریہ دت رام چیرمین میونسپل بورڈ فیض آباد کو رسیور مقرر کر کے
مسجد میں تالا لگا دیا، اور فریقین کے نام نوٹس جاری کر دی کہ وہ اپنے اپنے دعوی کے سلسلہ میں ثبوت پیش کریں، یہ حکم
۱۹ جنوری ۱۹۵۰ء کو جاری ہوا، مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی پورے ملک میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات
بہت خراب ہو گئے۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمن
سیوہاروی نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی توجہ اسکی طرف دلائی، یوپی میں اسوقت وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت
تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کے حکم سے انھوں نے فیض آباد کے ضلع مجسٹریٹ کو ضروری کاروائی کرنے کی ہدایت دی،
اسوقت وہاں ضلع مجسٹریٹ کے۔ کے۔ نائر تھے، مگر وہ خاطر خواہ کاروائی نہ کر سکے تو ان سے استعفیٰ لے لیا گیا،
مگر مورتی مسجد میں رکھی رہی۔ (بحوالہ رسالہ۔ دار العلوم دیوبند۔ مارچ و اپریل ۱۹۸۶ء)

۱۹۵۰ء کا مقدمہ | اس کے باوجود ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء میں ہندوؤں کی طرف سے گوپال سنگھ وشارد
نے یہ دعوی دائر کیا، کہ مسجد رام جنم بھومی ہے، ہم یہاں پوجا پاٹ کرتے ہیں، مگر مسلمان اور ضلع کے
حکام اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ اس لیے ہندوؤں کو اس میں پوجا پاٹ کرنیکی باضابطہ اجازت دی جائے۔
شری گنبٹے پر پجاری کے دو خطوط | ان سارے حالات اور ہندو مسلم کشیدگی، بلوے اور فسادات سے

اس زمانہ میں گاندھی جی کے چہیتے اکشے برہمچاری کو بڑا دکھ پہونچا تو انھوں نے ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۵۰ کو اس زمانہ کے یوپی کے ہوم منسٹر لال بہادر شاستری کو یہ خط لکھا۔

"پیارے بھائی

مجھے افسوس ہے کہ بار بار کوشش کرنے کے باوجود بھی میں آپ کی توجہ اجودھیا کے واقعات کی طرف پوری طرح دلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی کی قربانی کے بعد ہمارے دل میں اپنے فرائض اور نصب العین کے احساس کی جگہ خوف وہراس نے قبضہ کرلیا ہے۔ اور ہم اپنے میں عوام کو راشٹریتا گاندھی جی کے اصولوں کی طرف متوجہ کرنے کی ہمت نہیں پاتے ہیں۔ اجودھیا کا معمولی سا واقعہ، ملک کی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے۔ ہم معمولی غور وفکر سے اس کو کامیابی کے ساتھ سنبھال سکتے تھے۔ آج نہ صرف فرقہ پرور جماعتیں اپنے سیاسی اغراض کے لیے فرقہ وارانہ زہر پھیلا رہی ہیں۔ بلکہ بعض کانگریس کے ذمہ دار لوگ بھی اپنے کو اس کے اثر سے نہ بچا سکے۔ یہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اس زہر کو بجھانے کے لیے اور مہاتما گاندھی کے نصب العین کو پھیلانے کے لئے ہم کو اسی راستہ پر چلنا چاہیئے جس پر وہ چل رہے تھے، کیونکہ ہمیں صرف اسی شکل میں کامیابی مل سکتی ہے۔ اسی وجہ سے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۵۰ سے صوبائی کانگریس کمیٹی کے دفتر کے سامنے مرن برت رکھوں گا۔ میرے مرن برت رکھنے کا مقصد گورنمنٹ کے اوپر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا نہیں ہے۔ بلکہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کے پاکیزہ اصولوں کو عوام کے دلوں تک پہونچا دوں۔ امید ہے کہ خدا مجھے اس میں کامیاب کرے گا۔ اپنشد ہمیں سبق دیتا ہے کہ غصہ پر شانتی سے۔ نفرت پر محبت سے اور جھوٹ پر سچ سے فتح حاصل کرو۔"

آپ کا اکشے برہمچاری

۱۰ فروری سنہ ۱۹۵۰ کو انھوں نے لال بہادر شاستری کے نام ایک دوسرا خط لکھا جس میں

اجودھیا کے مسلمانوں اور بابری مسجد کی حالت پر زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنے دکھ کا اظہار کیا، یہ خط حسب ذیل ہے:۔

پیارے بھائی

فرقہ ورانہ جنون کی جو آگ چند لوگوں نے اجودھیا اور فیض آباد میں بھڑکائی اس کی وجہ سے ملک میں تخریبی خیالات پھیلتے جا رہے ہیں، جب میں گورنمنٹ اور ذمہ دار لیڈر صاحبان کی توجہ اس موقع کی اہمیت کی طرف نہ کرا سکا تو میں باپو کے یوم شہادت یعنی ۳۰ جنوری سے مرن برت رکھنے پر مجبور ہو گیا، یہ برت میں نے چوتھی فروری کو اس وقت توڑا جب کہ آپ نے مجھے یقین دلایا کہ اجودھیا اور فیض آباد کے فرقہ ورانہ فساد کو ختم کرنے کے لیے گورنمنٹ مناسب تدابیر کرے گی، اور یہ کہا کہ گورنمنٹ کا ارادہ اس برت کی وجہ سے بہت مضبوط ہو گیا ہے، آپ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مقامی حکام نے فرقہ واریت کی آگ پھیلانے والوں کی ہمت بڑھائی تھی، اور یہ کہ ابتدا ہی میں حالات پر بہت آسانی سے قابو پایا جا سکتا تھا، شری نہرو دیال ترپاٹھی جیسے لیڈروں کے بیان اور تقریروں سے گورنمنٹ کے لیے حالات مشکل ہو گئے۔ اور مسئلہ کی پیچیدگیاں اور بڑھ گئیں، علاوہ ازیں پنڈت پنتھ نے بھی مجھ سے اپنی گفتگو کے دوران میں ان باتوں کو تسلیم کیا اور کہا کہ یہ ظاہر ہے کہ لوگ اس معاملہ کو سلجھانے میں کم سے کم معاون نہ ہو سکے ..... برت عارضی طور پر توڑنے کے بعد میں بیمار ہو گیا، اور ابھی حال تک صوبائی کانگریس کمیٹی کے دفتر میں پڑا ہوا تھا، اس وجہ سے کچھ عرصہ تک اس بارہ میں آپ کو تکلیف نہ دے سکا، لیکن بدقسمتی سے اور نہایت دکھ کے ساتھ مجھے یہ معلوم ہوا کہ اجودھیا اور فیض آباد کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں، بعض معزز مسلمان اس بنا پر مارے بھی گئے کہ انھوں نے انکار کیا کہ جس کو آج بابری مسجد کہتے ہیں وہ ہمیشہ سے ہندو مندر رہا ہے، مسلمانوں کا سماجی بائیکاٹ کرنے کا پروپیگنڈا برابر جاری ہے، مسلمان دہشت زدہ

ہوتے جارہے ہیں، اور اپنے بال بچوں کو اپنے رشتہ داروں کے پاس محفوظ مقامات پر بھیجتے جارہے ہیں، بعض نے ترک وطن بھی کر لیا ہے۔

میرا گھر بھی قفل توڑ کر لوٹ لیا گیا اور چند لوگوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے، اور جن لوگوں نے میرے اوپر حملہ کیا ان کی حوصلہ افزائی کے لیے پبلک جلسہ کیا گیا، اور اس رات تشدد کو قوت پہونچائی گئی، اس بات کا پبلک میں اعلان کیا گیا کہ اگر کوئی ہندو مجھے دیکھنے کے ساتھ ہی نہ مارے گا تو وہ ہندو دھرم کے خلاف گناہ کرے گا، میں ان چیزوں کا تذکرہ اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ آپ میری جان کی حفاظت کریں لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ جو دہشت ان تشدد آمیز حرکات کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے اس کا جلد از جلد انسداد کیا جائے، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کانگریس کے ذمہ دار لوگوں نے فرقہ پرستوں کی ان حرکتوں کی اجتماعی اور انفرادی لحاظ سے مخالفت کی تھی، اور گورنمنٹ کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جلد سے جلد امن بحال ہو جانا چاہئے، جس کی وجہ سے ان کی پبلک میں توہین کی گئی، اور ان کو خاموش کر دیا گیا۔

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس خط کی تحریر تک میرے علم میں کوئی ایسی بات نہیں آئی کہ جس سے معلوم ہوتا کہ حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا، اجودھیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی تاریخی یا مذہبی عقیدے کی بنا پر ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد محض سیاسی اغراض کا حصول ہے، اگر ان شدید خطرات کا مقابلہ کرنے کی جد وجہد میں کوئی کمی کی گئی، تو یہ لوگ اور بہت سے پیچیدہ مسئلے اسی قسم کے پیدا کر دیں گے، جن سے کانگریس کی قوت کمزور ہو جائیگی اور ان کے مقاصد حل ہو جائیں گے۔

میں اس وقت کمزور ہوں اور میری صحت خراب ہو رہی ہے، لہذا اپنی صحت درست

کرنے کے لیے تھوڑے عرصہ کے لیے باہر جا رہا ہوں میں آپ کو بعد میں اطلاع دوں گا کہ میں کہاں ہوں گا میں آخر میں نہ دل سے امید رکھتا ہوں کہ اس میمورنڈم پر جو میں آپ کے ہاتھوں میں دے رہا ہوں گورنمنٹ فوری اور موثر تدابیر اختیار کرے گی، باقی خیریت۔

آپ کا کشنے برمچاری۔

(بہ شکریہ احسنات اسلامی اردو ڈائجسٹ بابری مسجد نمبر)

شری اکشے برمچاری کا میمورنڈم شری اکشے برمچاری کے اس خط کے ساتھ جو میمورنڈم وزیر داخلہ وحکومت اتر پردیش کو بھیجا وہ اس لائق ہے کہ اسے ذیل میں مکمل نقل کر دیا جائے۔

نقل میمورنڈم اجودھیا اور فیض آباد کے واقعات اور بابری مسجد کا مسئلہ محض ایک مسجد یا مندر کا مسئلہ یا محض ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا نہ سمجھنا چاہیے، ان جھگڑوں کے پیچھے دراصل وہ رجعت پسندانہ سازش ہے جس کا مقصد کانگریس اور مہاتما گاندھی کے بلند اصولوں کی بیخ کنی ہے اور اس طرح الیکشن میں فرقہ وارانہ اور مذہبی جذبات کو ابھار کر الیکشن جیتنا اور کانگریس گورنمنٹ کو الٹ دینا مقصود ہے، ان سازشوں میں مقامی حکام بھی شریک رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ فیض آباد اور اجودھیا میں ایک قسم کی نراجی صورت پھیلی ہوئی ہے، ان رجعت پسندانہ عناصر کا حملہ خود میری ذات پر تین مرتبہ ہو چکا ہے، ایک دفعہ لوگ میرے گھر میں گھس آئے، اور مجھ کو مارا اور دوسری مرتبہ مجھ کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے مکان کے سامنے گھیر لیا، پولیس کو اطلاع بھیجی گئی، لیکن انھوں نے ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، کانگریس کے اور معزز اشخاص کو بھی سرکاری عمال کے سامنے پبلک میں گالیاں دی گئیں، اور لوگوں کو مار پیٹ کرنے پہ بھی ابھارا گیا، لیکن باوجود اس کے جن لوگوں نے یہ سب کیا ان کو حکام میں اور خصوصیت حاصل ہوتی گئی۔

جب گنج شہیداں اور دوسری قبریں جو بابری مسجد کے قریب تھیں مجرمانہ طور پر کھودی جا رہی تھیں، اور ان کی جگہ ایک چبوترہ تیار کیا جا رہا تھا، اس کے متعلق چند معزز مسلمانوں کی طرف سے ایک عرضی دفعہ ۲۹۵ تعزیرات ہند کے مطابق دی گئی، لیکن حکام نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

آج اجودھیا میں دفعہ ۱۴۴ تعزیرات ہند نافذ کر دیا گیا ہے، اور مسجد پر دفعہ ۱۴۵ کی رو سے گورنمنٹ نے قبضہ کر لیا ہے، لیکن ان احکامات کی برابر خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔

اسٹار ہوٹل کے واقعہ کی مثال اپنی قسم کی ایک ہی ہے۔ یہ ہوٹل ایک مسلمان کی ملکیت میں تھا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس ہوٹل کی عمارت کو زبردستی خالی کرا لیا، اور اسے ایک دوسرے شخص کو دیدیا جس نے گومتی ہوٹل کے نام سے ایک دوسرا ہوٹل کھول دیا۔

ان باتوں نے ہماری اس نامذہبی جمہوریت اور کانگریس حکومت کے خلاف عوام میں غلط قسم کے خیالات پیدا کر دیئے ہیں، لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ کانگریس رجعت پسند طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتی، اور اب فرقہ واریت اور مذہبی رجعت پسندی کو اس ملک میں بہت جلدی جلدی غلبہ حاصل ہو جائے گا،

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کی تعداد ملک کی آبادی میں ۸۵ فیصد ہے، وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں، قانون کا انحصار ان کی مرضی پر ہے، اس غلط خیال کی وجہ سے جو لوگ اب تک فرقہ وارانہ اور رجعت پسندانہ خیالات کی مخالفت کرتے تھے، اب اس کی موافقت کرنے لگے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ جب یہ ہونا ہی تھا، تو ہم کیوں اس خیال کے مخالف رہیں، دوسری طرف اس حالت کے پیدا کرنے میں کامیابی حاصل ہونے پر رجعت پسندوں نے اپنے میں خود اعتمادی پیدا کر لی ہے، اور وہ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ انہیں وہ درجہ حاصل ہو گیا ہے، کہ جہاں سے کانگریس اور اس کے

ـوروں کو وہ کمزور کر سکتے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ اس قسم کی باتیں یہ لوگ دوسرے شہروں میں
ـ پھیلائیں گے، اور اس کے ذریعہ سے وہ حالت پیدا کر دیں گے جس میں کانگریس ان کی
ـوی کر کے انہی لوگوں کا ایک جزو ہو جائے گی۔ یا پارلیمنٹ ونابود ہو جائے گی۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں رجعت پسندوں کے حملہ کی مخالفت پوری قوت سے کرنا
ـیئے اور اس زہریلے ماحول کو قبل اس کے کہ یہ پوری طور سے پھیلے، فنا کر دینا چاہئے۔ ہیں اجودھیا
ـ حالات کو پورے طور سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔

گذشتہ ۱۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو مجھے معلوم ہوا کہ بابری مسجد سے متصل قبروں کو مجموعی طور پر کھودا
ـرہا ہے، قبریں کھودی جارہی تھیں۔ اور قبرستان کے وسط میں ایک پرانی بنیاد پر جسے مسلمان
ـ قناتی مسجد کہتے ہیں، ایک چبوترہ بنایا جا رہا تھا۔ مسلمانوں پر خوف وہراس طاری تھا،
ـانوں سے معلوم ہوا کہ انھوں نے حالت کو سنبھالنے کی نیت سے دفعہ ۲۵ تعزیرات ہند کی
ـرسے ایک درخواست سٹی مجسٹریٹ کو دی تھی جس میں یہ استدعا کی گئی تھی کہ چونکہ اس قسم کے
ـال سے نقض امن کا اندیشہ ہے، لہذا انہیں روک دیا جائے۔ لیکن اس پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی
ـ نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے تنہائی میں گفتگو کی۔

۵ نومبر ۱۹۴۹ء کی رات کو میرے مکان میں تین آدمیوں نے گھس کر مجھے زدوکوب کیا
ـتعجب کی بات ہے کہ جو باتیں میرے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے درمیان تنہائی میں ہوئی تھیں
ـ حرف بحرف ان لوگوں نے دہرادیا، اور بعد میں دوسرے لوگوں سے بھی کہا۔

بابری مسجد کے سامنے جہاں قبریں کھودی گئی تھیں وہاں نور وزتک رامائن کا پاٹھ ہوتا رہا
ـ ہوجن بھنڈارے بہت دنوں تک ہوتے رہے، بڑی بڑی سبھائیں ہوتی رہیں، تانگوں اور موٹروں
ـ لاوڈ اسپیکروں کے ذریعہ سے مشتہر کیا گیا، کہ رامچندر جی کی پیدائش کی زمین کو واپس لیا جا رہا ہے،

یگیہ ہو رہا ہے، درشن کے لیے میلوں باہر سے لوگ موٹروں میں ہزاروں کی تعداد میں آنے لگے جن میں جوش سے بھرے ہوئے لکچر دیئے جاتے تھے، اور کہا جاتا تھا کہ بابری مسجد کو شری رام مندر بنانا ہے۔ مہاتما گاندھی، نیز کانگریس اور کانگریسیوں کو گالیاں دی جاتی تھیں، میرے اور شری سدھیشوری پرشاد صدر سٹی کانگریس کمیٹی فیض آباد کے خلاف بہت زیادہ جوش پھیلایا جاتا تھا، اور حملہ کرنے کے لیے للکارا جاتا تھا۔ اس مضمون کی نوٹسیں تقسیم کی گئی تھیں، اور مقامی ہفتہ وار اخبار "درگت" میں غلط باتوں کے ذریعہ سے پبلک کے جذبات مشتعل کیے گئے تھے، رامائن کا پاٹھ ہوتے وقت سرکاری حکام کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہوا تھا، اس کے علاوہ پرانی قبروں اور مسلمانوں کے متبرک مقامات ہٹائے گئے۔ اور ان جگہوں پر شیوجی کی مورتی اور دوسرے ہندو دیوتاؤں کی مورتیاں نصب کر دی گئیں، اس طرح منظم طور پر فرقہ وارانہ زہر پھیلایا گیا، حکام کے رویہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، یا تو سرکار کی مرضی سے ہو رہا ہے یا سرکار نے فرقہ پرست طبقہ کے سامنے اپنے کو ڈال دیا ہے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی صبح کو جس کی شب میں بابری مسجد میں رام چندر جی کی مورتی رکھی گئی تھی۔ قریب نو بجے مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بتایا کہ انھیں شری بھائی لال کے ذریعہ تقریباً چھ بجے صبح کو معلوم ہوا کہ مسجد میں مورتی رکھ دی گئی ہے، اسے دیکھنے گیا تھا، وہاں سے ابھی لوٹا ہوں۔

یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ مسجد میں جہاں پولس کا پہرہ تھا، ان پہرہ داروں میں کسی کو خبر نہ ہو سکی، اور بھائی لال کو اتنے سویرے اطلاع مل گئی، اور یہ کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس بات کی جانچ کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی کہ شری بھائی لال کو اتنے سویرے یہ خبر کیسے ملی، یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس قسم کی بہت سی خبروں کا راوی شری بھائی لال کو بتاتے ہیں۔

میں تقریباً بارہ بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہمراہ بابری مسجد میں گیا، جہاں مورتی رکھی ہوئی تھی، تھوڑے سے آدمی مسجد کے پاس جمع تھے، اس وقت آسانی سے مسجد کی حفاظت کی جا سکتی تھی، اور مورتی کو ہٹایا جا سکتا تھا، لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کو مناسب نہیں سمجھا، صبح ہی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سے منادی کی جانے لگی کہ بھگوان ظاہر ہوئے ہیں، ہندو درشن کے لیے چلیں، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہمراہ جاتے وقت میں نے فیض آباد اور اجودھیا میں اس اعلان کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی، جوش بڑھتا بھی اور نوٹسیں تقسیم کی جانے لگیں، موٹروں میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ درشن کے لیے آنے لگے، مجمع میں پر جوش تقریریں ہوتی تھیں، اور کہا جاتا تھا کہ کانگریس ہندو دھرم کو برباد کر رہی ہے، پاکستان میں ایک مندر بھی نہیں رہ گیا ہے، پھر اجودھیا میں مسجد اور قبرستان کیوں ہونا چاہیے، ہم لوگوں کو مل کر اجودھیا سے مسلمانوں کا نشان مٹا دینا چاہیے، یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب کانگریس کا تختہ الٹ دیا جائے، کانگریس کے اکثر لوگ اس خیال کو زیادہ پسند کرتے ہیں، لیکن پنڈت جواہر لال جی اور کچھ اور لوگ بھی مسلمانوں کا ساتھ دے رہے ہیں، انھیں ختم کرنا ہوگا، اجودھیا میں اکشے برہمچاری، اور سدھیشوری پرشاد کو نہیں رہنے دینا چاہیے، یہ ہندو دھرم کو بڑھنے نہیں دینا چاہتے ہیں، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے قہقہوں کے درمیان یہ نعرے لگائے جاتے تھے، اکشے برہمچاری اور سدھیشوری کا ناش ہو، اکشے اور سدھیشوری کو مار ڈالو، یہ مذہب کے دشمن ہیں، مسلمان ہو گئے ہیں، مسلمانوں کی حفاظت کے لیے کانگریس حکومت پر اثر ڈال رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ، پارلیمنٹری سکریٹری گووند سہائے کے ایک بڑے جلسے میں بھی ان لوگوں نے پکڑ کر کہا، اور مذکورہ بالا نعرہ لگا کر مجمع کو مشتعل کیا۔

شری وشمبھر دیال ترپاٹھی، اور شری رگھوداس وغیرہ جیسے کانگریسی لیڈران بھی اس موقع پر اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور انھوں نے اجودھیا کی مسجد والے جلسے میں رجعت پسندوں کی حرکتوں کی

موافقت میں تقریریں کیں۔ انھوں نے کہا کہ جمہوریت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اکثریت جسے پسند کرے وہ ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہاں کے لوگ یہاں مسجد نہیں پسند کرتے لہذا کوئی اس کو لوٹا نہیں سکتا، اگر گورنمنٹ نے اس معاملہ میں مداخلت کی تو میں استعفا دیدوں گا۔ میں گورنمنٹ کی طرف سے آیا ہوں اور ذمہ داری سے ساتھ کہہ رہا ہوں۔

راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں نے جلسوں میں کانگریس حکومت کو دھمکی دی، اور کہا کہ یہاں مسجد نہیں ہو سکتی، دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود، سرکاری اجازت کے بغیر ان لوگوں کے بڑے بڑے جلوس نکلتے اور جلسے ہوتے تھے، دفعہ ۱۴۴ کی پابندی صرف مسلمانوں تک ہی محدود تھی، جس کی وجہ سے یہ لوگ بابری مسجد میں نماز پڑھنے سے روک دیے گئے، کئی روز اجودھیا میں مسلمانوں کا داخلہ روک دیا گیا، لیکن ہندوؤں پر جنھوں نے جوش پھیلانے کے لیے یہ حرکتیں کی تھیں، اس دفعہ کا کوئی اثر نہ تھا، باوجودیکہ بابری مسجد پر گورنمنٹ نے حسب دفعہ ۱۴۵ قبضہ کر لیا تھا، لیکن اس پر پوجا پاٹ جاری رکھا گیا، اور مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے محروم کر دیا گیا۔

اسٹار ہوٹل کا سوال بھی بہت اہم ہے، شری بھائی لال نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اطلاع دی کہ باہر کے کچھ مسلمان آکر اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، ان کے پاس اسلحہ وغیرہ بھی ہیں، ہوٹل کی تلاشی لی گئی، وہاں کوئی دوسرے اسلحہ نہیں ملے، صرف چار آدمی ملے، ان میں ایک شخص سلطان پور کا باشندہ ہے، اور بسکٹ کا کاروبار کرتا ہے، بسکٹ خریدنے فیض آباد آیا تھا، اس کے خلاف دفعہ ۱۰۹ تعزیرات ہند کا مقدمہ چلایا گیا۔ اور ہوٹل کو اسی وقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنی موجودگی میں بے گناہ ہوٹل کے مالک سے خالی کرا لیا، بعد میں وہ ہوٹل کا مکان دوسرے کو دیدیا گیا، اب پتہ چلا ہے، کہ وہاں ایک دوسرا ہوٹل گومتی ہوٹل کے نام سے بڑے جشن کے ساتھ

لکھا گیا ہے۔ اس کا افتتاح ڈسٹرکٹ جج نے کیا، اس رسم میں دوسرے حکام نے بھی شرکت کی۔ اس واقعہ سے مقامی لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مسلمانوں نے حقیقت میں کوئی بڑی سازش کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ والوں کو اپنے پرجوش عمل کو صحیح ثابت کرنے کا ایک آلہ مل گیا ہے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی مذہب پرستی کی ساکھ بڑھ گئی ہے، اور یہ چرچا ہونے لگا ہے کہ مذہب کی رکھشا کے لیے انھوں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا اور انھوں نے صورتحال کا نہایت ہوشیاری سے مقابلہ کر کے ہندو لیڈروں کی جانیں بچائیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسٹار ہوٹل کا مالک ایک پرانا نیشنلسٹ ہے، اور قوم پرستی کے سبب سے پچھلے دنوں الیکشن کے زمانہ میں لیگیوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا، اور ہوٹل پر دھرنا دیا تھا، یہ معلوم رہے کہ اس سے پہلے چار فرقہ وارانہ فسادات فیض آباد میں ہو چکے ہیں جن میں مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے ہیں، لیکن گورنمنٹ کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ گذشتہ بقرعید کے موقع پر جس طرح مسلمانوں کے مکانات لوٹے اور جلائے گئے اور انھیں پیٹا گیا۔ اور عورتوں اور بچوں پر وحشیانہ طریقہ سے حملہ کر کے گھائل کیا گیا وہ اتفاقی واقعہ نہیں تھا، اس سلسلہ میں ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے صدر، شری راجہ رام مصرا اور سٹی کانگریس کمیٹی کے صدر شری سدھیشوری پرشاد اور ضلع بورڈ کے صدر للن جی کو گالیاں دی گئیں، ان کے خلاف حملہ کرنے کے لیے لوگوں کو اکسایا گیا، نوٹسیں تقسیم کر کے ان کاموں کو حق بجانب قرار دیا گیا، حکومت کو یہ سب معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے عدم کارروائی کی وجہ سے شرارت پسند لوگوں کی ہمت بڑھتی گئی، اور مسلمان اپنے آنسو پی کر خاموشی اختیار کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ آنریبل ہوم منسٹر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں گھائل مسلمانوں اور ان کے لٹے ہوئے اور جلے ہوئے مکانوں کو خود آ کر دیکھوں گا، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

آج فیض آباد اور اجودھیا میں مسلمانوں میں بہت زیادہ خوف و ہراس طاری ہے اور ان میں سے بیشتر لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیج دیا ہے، اور کچھ لوگ اپنے خاندانوں سمیت ترک وطن کر گئے ہیں۔ میں نے بہت زیادہ کوشش گورنمنٹ کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی کی۔ مگر ناکام رہا۔ اس طرف اس کا پتہ چلا ہے کہ اجودھیا کے مسلمانوں پر یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اعلان کریں کہ بابری مسجد، ہندوؤں کا مندر ہے، اس کے لیے دھمکی بھی دی جا رہی ہے۔ دکانداروں کو دوکان خالی کرنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ ان سے ترک موالات کرنے کا پروپیگنڈا ہو رہا ہے کچھ معزز مسلمانوں پر حملہ کر کے انھیں گھائل کیا گیا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میرے مکان واقع جانکی گھاٹ اجودھیا کا تالا توڑ کر سب سامان لوٹ لیا گیا ہے۔ مکان پر قبضہ کر کے کچھ لوگ رہنے لگے ہیں۔ وہاں جلسوں میں پرچار کیا گیا ہے کہ میں اجودھیا میں داخل نہ ہو سکوں اور جو ہندو مجھے دیکھنے کے بعد مجھ پر حملہ نہ کرے وہ گئو ہتیا کا گنہگار ہوگا، وغیرہ۔ میں اس مسئلہ کو مسجدوں یا مسلمانوں کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا، بلکہ میرے پیش نظر کانگریس اور مہاتما گاندھی کے وہ بہت بلند اصول ہیں، جن کے لیے ہم اب تک لڑتے رہے ہیں۔ اگر ہم نے اپنی پوری طاقت سے ان رجعت پسندانہ خیالات کا تدارک نہیں کیا تو کانگریس کا نصب العین ختم ہو جائے گا، اور عوام میں رجعت پسند خیالات کا پرچار ہونے لگے گا۔ میں پنڈت جی اور سرکار کو دھیان اجودھیا کی حالت کی طرف موڑ کر یہ التجا کرنا چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اس کی صورت حال کو سنبھالیں اس طرح فساد پھیلانے والے عناصر اور ان سرکاری حکام کے خلاف جنھوں نے اس میں مدد دی ہے، سخت کاروائی کریں اور حملہ کرنے والوں کے خلاف پوری کاروائی کر کے مسلمانوں کو محسوس کرنے کا موقع دیں کہ وہ ایسے ملک میں ہیں جہاں ان کی جان اور ان کا مال محفوظ ہے، ان کے عبادت خانوں اور متبرک مقاموں کو واپس کر کے ان کے مذہبی جذبات کی حفاظت کریں، اور اس طرح ملک میں مہاتما گاندھی کے ۔۔

اصولوں کی تبلیغ کرکے سچے رام راج کو قائم کرنے میں کامیابی حاصل کریں' بابری مسجد کے سلسلہ میں یہ کہنا کہ چونکہ اس مسجد کی بنا شری رام چندر جنم استھان مندر کو توڑ کر قائم کی گئی ہے، لہذا وہ ہندوؤں کو واپس ملنی چاہیئے، یہ ایک تاریخی سوال ہے، لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے فیصلہ کرنے کے بعد بھی ایسے مقامات کے بارہ میں کیا طرزِ عمل ہونا چاہیئے، ایسا اصولی سوال ہے جس پر بنیادی طور پر غور کرنا ضروری ہے، میں التجا کرتا ہوں کہ ہمارے لیڈران اس بارہ میں کوئی صاف اور مستقل حل مرکزی حیثیت سے نکالیں، ایسے معاملات میں خاموش رہ کر اپنی رضامندی نہ ظاہر کرنی چاہیئے۔

مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۵۰ء اکشے برہمچاری ممبر پردیش کانگریس کمیٹی و سکریٹری ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی فیض آباد۔ (بشکریہ الحسنات اسلامی) اردو ڈائجسٹ بابری مسجد نمبر اگست ۱۹۸۶ء

فیض آباد کے اس پی اور ڈپٹی کمشنر کی رپورٹیں	اکشے برہمچاری کے ان خطوط اور میمورنڈم کے باوجود حکومت نے بابری مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کرنے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں

اٹھایا، گوپال سنگھ ویشارد کا مقدمہ جاری رہا، اور اس مقدمہ کے سلسلہ میں یکم جون ۱۹۵۰ء کو فیض آباد کے ایس۔ پی کرپال سنگھ نے جواب دعوی داخل کیا، تو اس میں لکھا کہ

یہ زمانہ قدیم سے بابری مسجد ہے، اور اس میں ہمیشہ سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں ہے (بحوالہ رسالہ دار العلوم دیوبند اپریل ۱۹۸۷ء)

یہ کسی مسلم سرکاری عہدیدار کی رپورٹ نہ تھی، بلکہ ایک انصاف پسند غیر مسلم سرکاری ملازم کی تھی، اس کی تائید فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر نے بھی کی۔

جے۔ این۔ اوگرا ڈپٹی کمشنر فیض آباد کا تحریری بیان	۲۴ اپریل ۱۹۵۰ء کو فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر جے۔ این۔ اوگرا نے فیض آباد کے سول جج کی عدالت میں، ایک حلف نامہ داخل کیا

جس کے مختلف پیراگراف میں یہ بیانات دیے۔

پیرا ۱۴۔ یہ چاند اور ناکی بابری مسجد کے نام سے مشہور ہے، اور لمبے عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمان استعمال کرتے ہیں، مسلمان اس میں نماز پڑھتے ہیں، اسکا استعمال رام چندر مندر کی طرح کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔

پیرا ۱۵۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں رام چندر کی مورتی کو چوری اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا۔

پیرا ۱۶۔ اس غلط اور غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ اور علاقہ میں نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس لئے حکام کو امن و امان کی خاطر مداخلت کرنی پڑی۔

پیرا ۱۷۔ ہندو مسلمان میں کشیدگی پیدا ہوئی تو سٹی مجسٹریٹ گرو دت سنگھ نے ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو سکشن ۱۴۴ نافذ کر دیا۔

پیرا ۱۸۔ اسی تاریخ کو ڈویشنل مجسٹریٹ شری مارکنڈے سنگھ نے فریقین کو طلب کر کے اپنا اپنا معاملہ پیش کرنے کو کہا۔

پیرا ۱۹۔ مجسٹریٹ مذکور نے صورت حال کو نازک پاکر آراضی کو قرقی کرنے اور فیض آباد اجودھیا کے میونسپل بورڈ کے چیرمین کو ریسیور مقرر کیا۔ اور ان کو اختیار دیا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کریں، اور اس کے نظم و نسق کے لیے اسکیم پیش کر کے منظوری لیں (بحوالہ مسلم ام۔ ال۔ اے میمورنڈم ۱۳ فروری ۱۹۸۶ء نیز رسالہ دارالعلوم دیوبند مارچ و اپریل ۱۹۸۶ء)۔

اس کے بعد فیض آباد کے سول جج کا جو فیصلہ ہوا، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سول جج فیض آباد کا ۱۹۵۱ء کا فیصلہ	سول جج فیض آباد مورخہ ۳ مارچ ۱۹۵۱ء مقدمہ نمبر ۲ سنہ ۱۹۵۰ء شری گوپال سنگھ وشارد اپیلانٹ بنام ظہور احمد وغیرہ۔ مدعی علیہم۔

حکم

گوپال سنگھ وشارد نے موجودہ مقدمہ کو ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء میں درج ذیل دعویٰ اور الزامات کے ساتھ پیش کیا۔

وہ (مدعی) ایک ساتن ہندو ہے، اور اجودھیا کا باشندہ ہے، وہ اجودھیا میں جنم بھومی کی شری رام چندر جی کی مورتی کی پوجا ہمیشہ سے کرتا رہا ہے، اور وہاں جاتا رہا ہے ۱۴ جنوری ۱۹۵۰ء کو حکام یعنی مدعیٰ علیہ ۱۰ نے بے وجوہات اور بے بنیاد اشتعال کی بنا پر، جنم بھومی میں جانے سے اور وہاں مذکورہ مورتی کی پوجا پاٹ کرنے سے روک دیا مدعیٰ علیہم ساتا لغایت ۹ جو کہ مدعیٰ علیہ ۱۵ کے مقامی ہمدرد ہیں، وہ مقامی ہندو عوام پر ناجائز دباؤ ڈال رہے ہیں، اور اس بات کی ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ جنم بھومی میں داخل ہونے سے احتراز کریں، اس سلسلہ میں ان کی عملی مدد ظہور احمد اور رفتار کی جانب سے ہو رہی ہو جن کو ان ہمدردوں کی ملی بھگت ہے، (حالانکہ) مدعیٰ علیہ ۱۵ اور مدعیٰ علیہم ساتا لغایت ۹ اس کا اختیار نہیں رکھتے ہیں کہ وہ مدعی کے مذہبی معاملات میں مداخلت کریں یا اس کو جنم بھومی میں پوجا کرنے سے روک دیں۔

مدعی کی دادرسی ذیل ہے۔

(۱) یہ قرار دیا جائے کہ وہ جنم بھومی میں شری بھگوان رام چندر اور دوسری مورتیوں کی ملکیت کا حقدار ہے، اور بغیر کسی مزاحمت یا دشواری کے وہاں کی مورتیوں کے درشن کا اختیار رکھتا ہے، اور

(ب) ذریعہ دوامی حکم امتناعی، مدعیٰ علیہم کو جنم بھومی سے مذکورہ مورتیوں اور شری بھگوان رام چندر کی مورتی کو ہٹانے سے روکا جائے۔

اس نے الگ درخواست میں ذریعہ بیان تحریری حلفی مطالبہ کیا کہ مدعا علیہ کے خلاف

ایک عارضی حکم امتناعی جاری کیا جائے، اور یہ کہ مقدمہ کا فیصلہ ملتوی کیا جائے۔

مدعی علیہم کو نوٹس جاری کیے گئے، اور ایک عارضی حکم امتناعی کو منظور کیا گیا، ذریں اثنا مدعی علیہم سے لغایتہ ۹ کو احکام، ۱۹ جنوری سنہ ۵۰ء ترمیم شدہ ۱۹ جنوری سنہ ۵۰ء جاری کیے گئے تاکہ میرے ذریعہ صادر ہوئے یک طرفہ حکم امتناعی مورخہ ۱۶ جنوری سنہ ۵۰ء کی تصریح یا ترمیم ہو سکے اس وجہ فریقین کو عبوری حکم امتناعی کے ذریعہ سے اس بات سے روکا گیا کہ وہ متنازعہ جگہ سے مورتیوں کو ہٹائیں یا پوجا وغیرہ کے ذریعہ دخل اندازی کریں، جیسا کہ موجودہ حالت ہے۔

حکم نامہ مورخہ ۱۹ جنوری سنہ ۵۰ء کا حکم اب تک برقرار ہے۔

مدعی علیہم ایک لغایتہ پانچ (۱) ظہور احمد (۲) حاجی پھیکو (۳) محمد فائق (۴) محمد سمیع (۵) محمد (اچھن میاں) نے عبوری حکم امتناعی کے خلاف ۲۱ فروری سنہ ۵۰ء کو ایک اعتراض داخل کیا جس میں درج ذیل بنیادوں پر اس حکم کے جواز کو چیلنج کیا گیا تھا کہ

(۱) متنازعہ زمین، بابری مسجد کا ایک حصہ ہے، جس کی تعمیر بادشاہ بابر نے کرائی۔
(۲) اور یہ ہمیشہ سے مسلمانوں کے استعمال میں رہی ہے (۳) اور یہ کہ ہندوؤں نے وہاں کبھی پوجا نہیں کی، (۴) اور یہ کہ وہاں موجودہ مورتیاں حال ہی میں رکھی گئی ہیں،

(۵) انھوں نے یہ بھی دلیل دی کہ مقدمہ بوجہ عدم نوٹس زیر دفعہ ۸۰ یو/ایس ضابطہ دیوانی ناقص ہے،

مدعی علیہم چھ لغایتہ نو (۶) اتر پردیش اسٹیٹ، (۷) ڈپٹی کمشنر فیض آباد (۸) سٹی مجسٹریٹ فیض آباد (۹) سپرنٹنڈنٹ آف پولیس فیض آباد، کی جانب سے ۲۰ مارچ سنہ ۵۰ء تک مزید کوئی اور اعتراض داخل نہیں کیا گیا۔

یہ اعتراضات مورخہ ۲۱ فروری سنہ ۵۰ء بتاریخ ۲ مارچ سنہ ۵۰ء زیر سماعت آئے،

اور مسٹر اقبال احمد نے منجانب مدعی علیہم ایک لغایۃ پانچ اپنی فاضلانہ بحث میں عمارت کے مختلف پہلو اور اس کے گرد و نواح کی طرف اپنی بحث کے استدلال میں توجہ دلائی جن کی تردید منجانب مدعی کی گئی۔ بایں حالت اجرائے کمیشن کی ضرورت پیش آئی کہ عمارت نزاعی کا نقشہ مرتب ہو۔ کمیشن کی تقرری کی تاریخ پر، مدعی علیہم نے درخواست گزاری کہ عمارت کی تصویر لی جائے، جو منظور کی گئی، نقشے اور تصویریں باضابطہ تیار کر لی گئیں اور اب وہ ریکارڈ کا حصہ ہیں۔

یہ مقدمہ ۱۰ فروری ۱۹۵۰ء کو دوبارہ سماعت کے لیے زیر بحث آیا جب کہ ڈسٹرکٹ گورنمنٹ وکیل نے جو کہ مدعی علیہم ۶ تا ۹ کی نمائندگی کرتا ہے، مدعی علیہم ایک لغایۃ پانچ کے اعتراضات و دلائل کو تسلیم کر لیا اور مزید یہ بحث کی کہ مقدمہ بعدم نوٹس زیر دفعہ ۸۰ ضابطہ دیوانی ناقص ہے، اس نے اپنے اعتراض مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۵۰ء پر زور دیا۔

یہ کہنا کافی ہے کہ دفعہ ۸۰ ضابطہ دیوانی والی دلیل لینا مدعی علیہم ایک لغایۃ پانچ کے کے لیے کھلی نہیں ہے۔

سنہ ۱۹۴۲ء ممبئی ۲۳۴، مدعی علیہم ۱ لغایۃ ۵ مشہور نظیر بھاگ چند بنام سکریٹری آف اسٹیٹ سنہ ۱۹۲۷ء پریوی کونسل صفحہ ۱۲۰ پر استدلال کرتے ہیں، مدعی کی طرف سے اس بات پر شدت سے زیادہ زور دیا گیا کہ بھاگ چند کے مقدمہ کی نظیر کا موجودہ مقدمہ پر اطلاق نہیں ہوتا، مدعی کی جانب سے یہ بھی کہا گیا کہ اس کی بنیاد گرشا سواری بنام ظہور احمد ۱۳۶ آل انڈیا کیس سی صفحہ ۱۱، سنہ ۱۹۳۳ء اور دوسرے ماقبل کے مقدمات پر ہے۔

اس مرحلہ پر فیصلہ صادر کرنا بے شبہ ایک نزاعی امر ہے، لہٰذا اس مرحلہ پر یہ فیصلہ کرنا قبل از وقت ہوگا کہ مقدمہ بعدم نوٹس زیر دفعہ ۸۰ ضابطہ دیوانی کی بنا پر لائق اخراج ہے۔

ان کارروائیوں کی خاطر یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا مدعی کے پاس کوئی زیادہ واضح سوال ہے، جو مطلوب حق کے وجود کے بارہ میں اٹھایا جاسکے یا پھر حکم امتناعی کے اٹھا لینے کی صورت میں یہ خطرہ تو نہیں کہ وہ اس حق کو کھودے یا انجام کاروہ کوئی ناقابل تلافی زحمت یا تکلیف یا نقصان میں مبتلا تو نہیں ہو رہا ہے۔

ہر لحاظ سے یہ تسلیم ہے کہ زیر بحث معاملہ میں مقدمہ قائم ہونے سے پہلے۔ متنازعہ زمین پر مورتیاں قائم تھیں۔

علاوہ ازیں اجودھیا کے کئی مسلمانوں کے تحریری بیانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم ۱۹۳۶ء سے مسلمانوں نے اس جگہ کو بطور مسجد استعمال نہیں کیا ہے اور نہ وہاں نماز ادا کی ہے، اور یہ کہ ہندو وہاں پوجا وغیرہ کرتے رہے ہیں۔

کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جس سے ان تحریری بیانات کے متعلق بدگمانی کی جائے، البتہ متنازعہ زمین پر مورتیوں کے وجود سے یہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ مدعی کو مقدمہ دائر کرنے کے لیے ایک واضح جواز دستیاب ہے۔

مدعی علیہم ایک لغایت پانچ، ان متعدد دستاویزوں پر استدلال کرتے ہیں، جو ظاہر کرتی ہیں۔ کہ متنازعہ زمین ہمیشہ سے مسجد رہی ہے۔

اس مرحلہ پر یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی فیصلہ صادر کیا جائے، کیونکہ اس کا فیصلہ اس وقت ہی ہوگا جب کہ فریقین کی جانب سے مہیا کردہ تمام زبانی اور تحریری شہادتوں پر غور کر لیا جائے، غیر متنازعہ حقیقت یہ رہ جاتی ہے کہ اس مقدمہ کی تاریخ کے وقت سری بھگوان رام چندر کی مورتی اور دوسری مورتیاں اس جگہ پر قائم ہیں، اور ہندو اور مدعی ان کی پوجا کرتے رہے ہیں۔ گو اس راہ میں انتظامی حکام کی جانب سے کچھ بندشیں عائد رہی ہیں۔

فریقین کے مذکورہ بالا بیانات، مدعی کے لیے بادی النظر میں مقدمہ ضرور بناتے ہیں، جہاں تک توازن سہولت کا تعلق ہے، یہ واضح ہے کہ حکم امتناعی عارضی کو اس مرحلہ پہ خارج کرنے سے مدعی کو اس حق سے جس کو اس نے اپنے مقدمہ میں مانگا ہے، محروم کرنا ہوگا۔ مزید برآں یہ درمیان فریقین تسلیم شدہ معاملہ ہے کہ اس محلہ میں کئی دوسری مسجدیں ہیں، اس لیے اگر مقدمہ کے زیر سماعت رہنے تک حکم امتناعی بدستور جاری رہے تو مقامی مسلمانوں کے لیے نماز ادا کرنے میں زیادہ زحمت پیدا نہ ہوگی۔

ان اسباب کی بنا پر میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ موجودہ حالت، بدستور جاری رہے۔

حکم

عبوری حکم امتناعی مورخہ ۱۶ جنوری ۵۰ء جس میں ترمیم شدہ مورخہ ۱۹ جنوری ۵۰ء میں ترمیم کی گئی تھی، وہ تا فیصلہ مقدمہ ہذا نافذ رہے گا۔

اس فیصلہ کا اردو ترجمہ اس متن سے کیا گیا، جو مسلم انڈیا انگریزی میں مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔

تبصرہ | پہلے ذکر آیا ہے، کہ اس مسجد میں ۱۹۴۹ء میں تالا اس لیے لگا دیا گیا کہ ۲۲-۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں ہنت ابھے رام نے اپنے چیلوں سمیت مسجد میں گھس کر مورتیاں رکھ دیں، جس کے خلاف ماتو پرشاد کانسٹبل نے رپورٹ درج کی، پھر اس کا بھی ذکر آچکا ہے کہ اس رپورٹ کی بنیاد پہ فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ نے نقض امن کی خاطر مسجد کو قرق کر لیا۔ اور ایک ریسیور مقرر کر دیا کہ وہ دیکھ بھال کرے کہ اس مقدمہ کے فیصلہ ہونے تک نہ وہاں پوجا ہو اور نہ وہاں نماز پڑھی جائے اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ مذکورۂ بالا مقدمہ سے پہلے فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر جے۔ ان۔ اوگرا، اور ایس پی کرپال سنگھ نے ۱۹۵۰ء

میں جو بیانات دیئے، ان میں یہ تسلیم کیا کہ یہ بابری مسجد ہے، اس میں ہمیشہ سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں، ہندوؤں کا اس سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں رہا ہے لیکن فاضل جج نے ان سرکاری بیانات کو نظر انداز کر دیا۔ اور اپنے فیصلہ میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس میں پوجا ہوتی رہی ہے، اس لیے کہ وہاں مورتیاں موجود ہیں، مورتیاں تو وہاں زبردستی رکھ دی گئی تھیں، فاضل جج نے اس کی طرف بھی اشارہ نہیں کیا، اور چونکہ وہاں مورتیاں موجود تھیں، اس لیے یہ خیال کیا گیا کہ وہاں پوجا بھی ہوتی رہی ہوگی، حالانکہ حکومت کی طرف سے جو تالا لگایا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ حکم تھا کہ وہاں نہ پوجا ہو اور نہ نماز پڑھی جائے، جبتک کہ اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو جائے لیکن فاضل جج نے ان باتوں کو نظر انداز کر دیا۔

مگر فاضل جج کا یہ فیصلہ یوں غنیمت رہا کہ انھوں نے ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء کے امتناعی حکم کو برقرار رکھا یعنی وہاں سے نہ مورتیاں ہٹائی جائیں گی، اور نہ وہاں ان کی پوجا ہوگی۔

۱۹۶۰ء کا فیض آباد گزیٹیر

۱۹۶۰ء میں فیض آباد کا گزیٹیر ایک خاتون مسز ایشا بسنتی جوشی آئی اے۔ اس کی نگرانی میں مرتب ہوا، خیال تھا کہ قومی حکومت کے زمانے میں جو گزیٹیر تیار ہوگا، اس کا انداز اور لب ولہجہ ان گزیٹیروں سے مختلف ہوگا، جو انگریزوں کے زمانے میں تیار ہوتے تھے، مگر انگریزوں کا جادو سر پہ چڑھ کر بولتا رہا۔ اور ۱۹۶۰ء کے فیض آباد گزیٹیر میں بابری مسجد اور جنم استھان کی رہی روایتیں دہرائی گئیں جو پہلے کے گزیٹیر میں تھیں، گو جزوی ترمیم کرکے اسکو نیا بنانے کی کوشش کی گئی ہے، پھر بھی ان کو سامنے رکھ کر پڑھا جائے گا تو گذشتہ گزیٹیر کی سطروں کی سطریں اس میں بجنسہ نقل کر دی گئی ہیں، اس کے باب دوم، تاریخ کے ص، ۴۹ پہ یہ لکھا گیا ہے۔

دو موخر الذکر (بابر) اودھ پہونچا، تو بایزید اپنے خاندان کے ساتھ غازی پور فرار ہو گیا۔

بابر خود اودھ (اجودھیا) آیا، اور یہاں چند دنوں تک ٹھہرا (بحوالہ بابر نامہ۔ اے۔ اس بیوریج صفحہ ۶۰۱) یہاں کے باغوں، جھرنوں، خوش وضع عمارتوں درختوں خصوصاً آم کے پیڑوں اور رنگین کلغی دار پرندوں کو دیکھ کر متاثر ہوا، (بابر نامہ۔ صفحہ ۶۰۲) اسے اودھ کا گورنر باقی تاشقندی کو مقرر کیا، جس نے مقامی باغی سرداروں کی سرکوبی کی (بابر نامہ صفحہ ۶۷۹، صفحہ ۶۸۴-۶۸۵)

اس کے عہد حکومت میں باقی نے ۱۵۲۸ء میں اجودھیا میں ایک مسجد بنائی، مسجد کے اندر جو کتبہ ہے، اسی کی آخری سطر میں اس عمارت کی تعمیر کی تاریخ لکھی ہوئی ہے، (بابر نامہ LXXVII - VIII) اور وہ یہ ہے۔ گزیٹیر میں ان اشعار کے صرف مطلب لکھ دیے گئے ہیں

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش	بنائیست با کاخ گردوں ملاقی
بنا کردہ این مہبط قدسیان را	امیر سعادت نشان میر باقی
بود خیر باقی و سال بنایش	عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی ۹۳۵ھ

اور پھر صفحہ ۱۷۳-۱۷۴ پر یہ عبارت ہے۔

"۱۸۵۵ء میں بیراگیوں اور مسلمانوں میں بڑا سخت تصادم اجودھیا کے ہنومان گڑھی کی جائے وقوع کے لیے ہوا۔ دونوں کا یہ دعوی تھا کہ یہ ان کے مذہب کی عبادت گاہ ہے۔ واجد علی شاہ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس معاملہ کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی، اس کے لیے گلاب باڑی میں ایک عام جلسہ ہوا، وہاں جو لوگ جمع ہوئے ان میں سے کسی نے یہ بیان نہیں دیا کہ یہاں ایک مسجد تھی، اس لئے کمیٹی نے بیراگیوں کے حق میں فیصلہ دیا، جب کمیٹی کے اس فیصلہ کی خبر لکھنؤ پہونچی، تو وہاں مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا، ایک مجلس عمل بنائی گئی، جس کے رہنما امیٹھی (ضلع لکھنؤ) کے امیر علی جائے گڑھ سوہالی میں مقیم تھے، ان کے ارد گرد بہت سے ان کے معتقد جمع ہوگئے، بیراگیوں کو

معلوم ہوا تو انھوں نے اپنی مدافعت کی تیاری کی، واجد علی شاہ نے اپنی فوج کے ایک دستہ کو اس کی حفاظت کے لئے حکم دیا، بالآخر، نومبر ۱۸۵۵ء کو امیر علی رودولی کے بیے روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے پیرو تھے، کپتان بارلو نے ان کو واپس جانے کا حکم دیا، لیکن انھوں نے انکار کیا، تو ایک جنگ چھڑ گئی جس کے بعد وہ اور ان کے ساتھی مارے گئے"۔ (بحوالہ قیصر التواریخ یا تاریخ اودھ از کمال الدین حیدر، جلد ۲ صفحہ ۱۲۸ - ۱۱۰ جانیو شیمہ واء۔ ۱۸۹۶ء لکھنؤ)

باب ۱۹ میں صفحہ ۳۵۲ پر دلچسپ مقامات کے عنوان کے تحت یہ عبارت ہے۔

اجودھیا نمایاں طور پر مندروں کا ایک شہر ہے لیکن یہاں کی ساری عبادت گاہیں صرف ہندو مذہب ہی سے وابستہ نہیں ہیں، یہاں جینیوں کے بھی مندر ہیں، مسلمانوں کی بھی مسجدیں اور مقبرے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے زمانے میں ہندوؤں کے تین اہم مندر تھے، اور کچھ چھوٹے مندر بھی تھے، اور یہ جنم استھان مندر تھا، سورگ دوار تھا، اور تریتا کا ٹھاکر تھا' جنم استھان رام چندر کے پیدا ہونے کی جگہ تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب بابر ۱۵۲۸ء میں اجودھیا آیا تو اس کے حکم سے یہ پرانا مندر منہدم کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ پر وہ مسجد بنی جو بابری مسجد کہلاتی ہے، پرانے مندر کا سامان اس مسجد میں لگایا گیا، اور اس کے بعض ستون اب تک اچھی حالت میں ہیں وہ (Close Grained) کالے پتھر کسوٹی ہیں، ان میں ہندوؤں کے کئی (Base Relief) بھی ہیں، اس اصلی عمارت کی بیرونی شہتیر صندل کی لکڑی کی ہے، ستون کی اونچائی سات یا آٹھ فٹ ہے، نیچے، بیچ اور کیپٹل کا حصہ چوکور

بقیہ یا تو مدور یا ہشت پہل ہیں۔ اس میں دو کتبے فارسی میں ہیں، ایک تو باہر ہے، اور دوسرا منبر کے پاس ہے، جس میں ۹۳۰ھ لکھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے بھی اجودھیا کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی، جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں طویل تلخی رہی۔ دونوں طرف سے حملے اور جوابی حملے ہوتے رہے۔ اس کی انتہا ۱۸۵۵ء میں مولوی امیر علی کی قیادت میں پہونچ گئی۔ اس کے نتیجہ میں ۱۸۵۸ء میں مسجد کے سامنے ایک بیرونی احاطہ کر دیا گیا۔ ہندوؤں کو اندر جانے کی ممانعت ہو گئی، اور ان کو اس کے باہر ایک چبوترہ پر پوجا کرنے کو کہا گیا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد یہ صورت حال بدل گئی ہے: ہندو اس مسجد میں رام اور سیتا کی مورتیاں رکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، اس کی وجہ سے اس جگہ کے لئے بڑی مقدمہ بازیاں ہو رہی ہیں، اس وقت اندرونی حصہ کی حفاظت ایک مسلح گارڈ کے ذریعہ سے کی جاتی ہے، اور چند ہندو پجاریوں کو اس کے اندر جانے کی اجازت ہے۔

تبصرہ | اس گزیٹر کے بیانات میں بابر کا اودھ میں آنے، وہاں کے مناظر سے متاثر ہونے، امراء کی بغاوت کے کچلنے اور بابری مسجد کی تعمیر ہونے کی تاریخ کے حوالے مسز اے۔ اس بیورج کی بابر نامہ سے دیے گئے ہیں، اسی طرح مولوی امیر علی کی جنگی مہم کے سلسلہ میں قیصر التواریخ، تاریخ اودھ اور حدیقۂ شہدا کے حوالے ہیں، لیکن جب ایسے اہم بیانات قلمبند کئے گئے ہیں کہ بابر نے جنم استھان کے پرانے مندر کو منہدم کیا، اورنگ زیب نے اجودھیا کے مندروں کی بے حرمتی کی تو ان کے لئے کسی تاریخ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، پھر یہ بیانات کیسے قابل قبول ہو سکتے ہیں، صحیح بات تو یہ ہے کہ اس گزیٹر میں پرانے گزیٹروں

کی باتیں نقل کر دی گئی ہیں، اور بہت سے جملے تو بے بنیاد ہی کے ہیں، مرتب کو یہ خیال رہا ہوگا کہ تاریخی واقعہ کی سند کے لیے کسی گزیٹر کا حوالہ قابل قبول نہیں ہوتا، اس لئے اس میں اس کا حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھا گیا، پھر ان بیانات میں جو تضاد پیدا ہوگیا ہے، ان کو قلمبند کرتے وقت خیال نہیں رکھا گیا، پہلے تو یہ کہا گیا کہ بابر کے عہد حکومت میں باقی نے ۱۵۲۸ء میں اجودھیا میں ایک مسجد بنائی، اس کی سند میں کتبہ کے اشعار کے معنی پیش کئے گئے ہیں، لیکن آگے چل کر یہ لکھا گیا ہے، کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۲۸ء میں بابر اجودھیا آیا۔ اور اس کے حکم سے پرانا مندر (یعنی جنم ستھان) مسمار کر دیا گیا، اس کے جائے وقوع پر وہ مسجد بنی جو بابری مسجد کہلائی، مرتب کو اپنے بیان پر یقین نہ تھا، تو اور نہ ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ اس کی سند فراہم نہیں ہو سکتی ہے، اسی لیے "ایسا معلوم ہوتا ہے" لکھ کر بیان قلمبند کیا گیا ہے۔ جس کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی ہے، پھر اس میں یہ بھی بیان ہے کہ اورنگ زیب نے بھی اجودھیا کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں طویل تلخی رہی، اس بیان میں اس کی وضاحت نہیں ہے کہ کون سی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی گئی، مگر اس میں جب یہ لکھا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے طویل تلخی رہی۔ اور اس تلخی کا ذکر ہنومان گڑھی کے سلسلہ میں ہندو مسلمان کے شدید تصادم کی حیثیت سے کیا گیا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے ہنومان گڑھی ہی میں کسی مندر کو توڑ کر مسجد بنائی۔ مگر مرتب کا یہ بھی بیان ہے کہ اس جھگڑے کے سلسلہ میں واجد علی شاہ نے تحقیقات کی جو کمیٹی مقرر کی اور اس کے لیے گلاب باڑی میں جو ایک عام جلسہ ہوا، اور وہاں جو لوگ جمع ہوئے ان کا یہ بیان ہوا کہ وہاں کوئی مسجد نہ تھی اس سے تو اورنگ زیب پر سے یہ الزام خود بخود جاتا رہتا ہے، کہ اس نے ہنومان گڑھی کے مندر کو توڑ کر وہاں ایک مسجد بنوائی، مگر یہ صحیح نہیں کہ ہنومان گڑھی میں مسجد نہ تھی اس کا ذکر

ہم پہلے حدیقۂ شہداء اور قیصر التواریخ ہی کی روشنی میں کر چکے ہیں، مسلمانوں کا جو قتل عام انگریزوں کی وجہ سے ہوا، اس کی پوری تفصیل ان دونوں کتابوں میں ہے، جس کو گزیٹیر کے مرتب نے نظر انداز کر دیا ہے، اگر بار لو کا ہلکا ذکر کر دیا ہے، اگر اس میں اس کی تفصیل لکھ دی جاتی تو بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازع کی نوعیت کا پورا اندازہ ہو جاتا۔

یو۔پی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی طرف سے مقدمہ ۱۹۶۱ء

شری گوپال سنگھ وشارد کے مقدمہ کے علاوہ دو اور مقدمے دائر کیے گئے، ایک پریم ہنس، رام چندر داس اور ایک نرموہی اکھاڑے کی طرف سے ان کے جواب میں یو۔پی سنی سنٹرل وقف بورڈ کی جانب سے بھی مقدمہ دائر ہوا، اور مسجد کی واپسی کا دعویٰ کیا گیا، یہاں تک کی تمام مقدموں کی فائلیں الگ الگ تھیں، عدالت کی سہولت کی خاطر اس کے حکم سے ان کو یکجا کر دیا گیا، اور سنی سنٹرل وقف بورڈ کے مقدمہ ۶۱ / ۱۲ کو رہنما کیس قرار دیا گیا۔

مسجد میں تبدیلیاں

اس اثنا میں پریہ دت رسیور کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ پر کے۔کے رام ورما کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا، مگر ان کے رسیوری کے زمانہ میں ہندوؤں نے مسجد میں تبدیلی شروع کر دی تو مسلمانوں کی درخواست پر ان کو ہٹا دینے کا حکم دیا گیا، ہندو اس کے خلاف لکھنؤ ہائی کورٹ سے اسٹے آرڈر لے آئے، اس سلسلہ میں مقدمات کی جملہ فائلیں ہائی کورٹ میں طلب کر لی گئیں، جس کے بعد فیض آباد میں تمام مقدمات رک گئے، ہائی کورٹ کی طرف سے بھی اس سلسلہ میں مقدمہ کی کوئی سماعت نہیں ہو سکی۔

بابری مسجد میں غیر قانونی تبدیلیاں

۱۸۸۵ء کے مقدمہ کے سلسلہ میں ذکر آیا ہے کہ مسجد کے صدر دروازہ پر اللّٰہ کندہ تھا، مگر رسیور کے ہونے کے باوجود اس کو کھرچ کر مٹا دیا گیا، اور دروازہ پر جنم استھان مندر کا بورڈ لگا دیا گیا، پھر احاطہ کی شمالی چہار دیواری اور مسجد کی درمیانی

خالی جگہ پر سفید اور سیاہ سنگ مرمر کا فرش بنا دیا گیا، اور اس کا نام پری کرما رکھا گیا، (بیچ والی طرف کی جگہ) مسجد کے صحن میں اتر طرف ایک ہینڈ پائپ بھی لگا دیا گیا، اور پھر مسجد سے باہر پورب کی طرف ایک مندر بنا لیا گیا، اسی کے پاس ہنتوں کے لیے رہنے کی جگہ بھی بنائی گئی، دکھن کی طرف جنم استھان کے چبوترہ پر ایک مندر تعمیر کر لیا گیا ہے، اور اسی کے آس پاس دو مندر اور بھی بنا لیے گئے، مسجد کے درمیانی گنبد پر ایک جھنڈا لگا دیا گیا، یہ ساری تبدیلیاں سنہ ۱۹۶۷ء سے برابر ہوتی رہیں، اور ریسیور کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی، (رسالہ دارالعلوم دیوبند مارچ و اپریل ۱۹۸۶ء)

رمیش چندر پانڈے کی درخواست

۲۵ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء میں رمیش چندر پانڈے نے فیض آباد کے صدر منصف کے یہاں ایک درخواست دی کہ مسجد کا تالا کھول دیا جائے تاکہ ہندو وہاں جا کر پوجا پاٹ کر سکیں، مگر منصف صدر نے یہ کہہ کر درخواست رد کر دی کہ اس مقدمہ کی رہنما فائل ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے، اس لیے اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج کے یہاں اپیل

اس فیصلہ کے خلاف فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کے۔ ایم۔ پانڈے کی عدالت میں اپیل کی گئی، انھوں نے یکم فروری سنہ ۱۹۸۶ء کو یہ فیصلہ سنایا کہ ضلع انتظامیہ اس مسجد کا تالا کھول دے، اور ہندوؤں کو وہاں پوجا پاٹ کرنے کی اجازت دی جائے، ان کے فیصلہ کا متن ذیل میں درج ہے۔

شری کے۔ ایم۔ پانڈے ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کا فیصلہ، یکم فروری سنہ ۱۹۸۶ء

رمیش چند پانڈے مدعی بنام اسٹیٹ آف اترپردیش، اور ۲۰ دوسرے مدعیٰ علیہم یہ اپیل اس حکم کے خلاف ہے، جسے ہری شنکر دوبے منصف صدر فیض آباد نے مستقل مقدمہ نمبر ۲/۵۰ کے سلسلہ میں ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء کو صادر کیا تھا۔

مقدمہ کے حقائق مختصر طور پر اس طرح ہیں کہ مقدمہ ۲ الف اے ر ۵ میں مدعی نے

ک درخواست (۴۲۲ ر سی) اس مطلب کی گذاری کہ مدعی اور ہندو قوم کے دیگر افراد
ام طور سے شری بھگوان رام چندر جی کی مورتی کی پوجا اور درشن کرتے ہیں، اس کے علاوہ وہ
ن مورتیوں کی بھی پوجا کرتے ہیں جو اس مقدمہ کی اراضی سے متعلق ہیں، تو مدعی علیہم ۶ تا ۹ کو
ہدایت کی جانی چاہیے کہ وہ مذکورہ جگہ کے داخلہ کے دروازہ کو بند کر کے یا وہاں تالا بندی
رکے اس پوجا اور درشن میں کسی قسم کی پابندی یا رکاوٹ نہ پیدا کریں،

مدعی علیہم ۶ تا ۹ میں اتر پردیش اسٹیٹ، ڈپٹی کمشنر فیض آباد، سٹی مجسٹریٹ اور ایس پی
یں، ان لوگوں نے یہ اعتراض نامہ داخل کیا کہ وہ عدالت کے حکم مورخہ ۳ مارچ سنہ ۵۱ء کے
طابق مذکورہ مورتیوں کی پوجا میں مداخلت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں، وہ صرف اس بنیاد
ر درخواست کے مزاحم ہیں کہ نظم وضبط کی برقراری کے سلسلہ میں ضروری اقدامات اٹھانے
ے لیے ان کو اختیار دیا گیا ہے، اور ان کے اس حق کو کسی بھی طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا، فاضل
نصف نے درخواست نہ ہندو کو اس کی درخواست پر کسی قسم کی دادرسی نہیں کی، حتی کہ اس معاملہ
س کوئی حکم ہی نہیں صادر کیا، کیونکہ سالہ ۱۹۵۰ء کے رہنما مقدمہ نمبر ۱۲ کا ریکارڈ ہائی کورٹ کے
یش نظر ہے، اسی لیے فاضل منصف نے خود کو اس لائق نہیں پایا کہ وہ اس درخواست پر کوئی فیصلہ
ے، اس کی خاص بنیاد یہ ہے کہ کوئی بھی حکم جو اس معاملہ میں صادر کیا جائے گا وہ رہنما مقدمہ کی
ل میں بھی جاری کیا جائے گا، اور چونکہ رہنما مقدمات کی فائل دستیاب نہیں ہے، اس لیے
اضل منصف نے کوئی حکم جاری نہیں کیا۔

یہ بات درخواست کی نامنظوری کے مترادف ہے، لہٰذا مدعی نے موجودہ درخواست کو
یش کیا، مدعی نے اس درخواست میں صرف مقدمہ نمبر ۲ سنہ ۱۹۵۰ء کے مدعا علیہم ۶ تا ۹ کو
یثیت مخالف پارٹی کے اپنا فریق بنایا ہے۔

مدعی کہتا ہے کہ اس کو دوسرے مدعا علیہم سے کوئی شکوہ نہیں، اس لیے وہ ان لوگوں کو اپنا مخالف اور محاذی نہیں بنانا چاہتا۔

اس مقدمہ میں حکم امتناعی کا جو آخری حکم نافذ کیا گیا وہ ۳ مئی سنہ ۱۹۵۱ء کا ہے، اس حکم کے مطابق سول جج نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ حکم امتناعی مورخہ ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء ترمیم شدہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء نافذ رہے گا۔

۱۹ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو فاضل عدالت نے اس مفہوم کا حکم امتناعی جاری کیا کہ "فریقین کو حکم امتناعی کے ذریعہ بہر طور اس بات سے روکا جائے گا کہ وہ متنازعہ زمین کی مورتیوں کو ہٹائیں، یا پوجا کے ذریعہ مداخلت کریں، وغیرہ وغیرہ، جیسا کہ اس وقت معمول ہے۔"

فاضل عدالت کا یہ فیصلہ آج تک قائم ہے، اور مقدمہ نمبر ۲ سنہ ۱۹۵۰ء میں حکم امتناعی کے اس فیصلہ کی ہائی کورٹ نے بھی توثیق کر دی ہے۔

موجودہ درخواست میں صرف یہ نکتہ قابل غور ہے کہ آیا مدعی علیہم کو تالا ہٹانے کی ہدایت دی جا سکتی ہے؟ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پوجا کرنے اور پجاریوں کی آزادانہ آمد و رفت میں یہی خاص رکاوٹ ہے۔

میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس۔ پی فیض آباد کو اس معاملہ میں نوٹس جاری کیے، یہ دونوں میرے سامنے عدالت میں پیش ہوئے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان دیا کہ متنازعہ جگہ پر ایستادہ مورتیاں باہر سے دیکھی جا سکتی ہیں، بیرونی پھاٹک میں پٹے نہیں ہیں، خاص پھاٹک میں ایک سلاخوں والا جنگلہ ہے اور دو دروازے اندرونی احاطہ میں ہیں۔ سنہ ۱۹۵۰ء کے مقدمہ نمبر ۲ کے نقشہ نظری پیپر نمبر ۱۳۶ ارسہ میں ان دروازوں کو حروف 'پی' اور 'او' کے ذریعہ ظاہر

کیا گیا ہے، ان دونوں پھاٹکوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

ان کو (ڈپٹی مجسٹریٹ) یہ علم نہیں ہے کہ یہ تالے کب لگائے گئے، اور کس نے ان کو لگانے کا حکم دیا تھا، اس معاملہ کا کوئی ریکارڈ بھی دستیاب نہیں ہے کہ کس نے 'او' اور 'پی' پھاٹکوں پر تالے ڈالنے کا حکم صادر کیا۔

پجاری کو پوجا کرنے اور بھوگ کرنے کے لیے پھاٹک 'او' سے اندر جانے کی اجازت ہے، پھاٹک 'او' کا تالا نہیں کھلا ہے، نقشہ میں جو مورتیاں دکھائی گئی ہیں ان کے علاوہ اندر کے حصہ میں اور بھی مورتیاں ہیں، جب وہاں پوجا کی جاتی ہے تو ان مورتیوں میں سے اکثر کو باہر سے دیکھا جا سکتا ہے۔

مہنت کے علاوہ دوسرے افراد بھی سٹی مجسٹریٹ کی اجازت سے مذکورہ جگہ جا سکتے ہیں۔

گذشتہ ۳۵ یا ۳۶ سال سے دوسرے فرقے کے کسی بھی شخص نے وہاں نماز نہیں ادا کی ہے ان کو اس جگہ جانے کی اجازت بھی نہیں ہے، نقشہ کی لائن (ایچ اور جے) کے باہری جانب مورتیاں ہیں، اور بیرونی دیوار کے اندرون میں چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، اور پوجا کی جاتی ہے، اس مقام پر ۱۹۵۰ء سے اب تک نظم وضبط کا کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوا، نہ ہی کوئی فساد ہوا، پھاٹک 'او' اور 'پی' پر تالے صرف اس لیے پڑے ہیں کہ اندر رکھی ہوئی مورتیوں کی دیکھ بھال ہو سکے، کہ وہ کہیں غائب تو نہیں کر دی گئی ہیں، اور یہ تالے بھی عدالت کے حکم امتناعی کے احترام کے طور پر لگے ہیں۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مزید کہتے ہیں کہ مورتیوں کی حفاظت کے لیے پھاٹک 'او' اور پھاٹک 'پی' کو بند رکھنے کے علاوہ مورتیوں کی حفاظت اور نظم وضبط کی برقراری کے لیے دوسرے اور

طریقے بھی ہیں۔

وہ صراحت سے کہتے ہیں کہ اگر پھاٹک 'او' اور پھاٹک 'پی' کے تالوں کو کھول بھی دیا جائے تو متنازعہ جگہ پر رکھی ہوئی مورتیوں کی حفاظت اور امن کے قیام کے لیے دوسرے بھی طریقے ہیں۔

ایس۔ ایس۔ پی فیض آباد شری پرم ویر سنگھ سے بھی میں نے بیان لیا، انھوں نے بتایا کہ پولیس فورس متنازعہ جگہ پر برقرار ہے، وہ اجودھیا کے دوسرے مندروں پر بھی نظم و ضبط اور امن قائم رکھنے کے لیے پولیس کو تعینات کر دیتے ہیں، خصوصاً تیوہاروں کے موقع پر۔

انھوں نے یہ بیان دیا کہ خواہ پھاٹک 'پی' اور پھاٹک 'او' کے تالے کھولے جائیں، یا بند رکھے جائیں، نظم و ضبط اور امن کو کامیابی کے ساتھ قائم رکھا جا سکتا ہے نظم و ضبط اور مذکورہ جگہ کی حفاظت صرف پھاٹک 'او' اور پھاٹک 'پی' کے تالوں پر ہی منحصر نہیں ہے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا مندرجۂ ذیل بیان نہایت برمحل ہے:

''او' اور 'پی' گیٹ پر تالا بند کرنے کے علاوہ اور بھی طریقہ سے مورتیوں کی سُرکشا (حفاظت)، کی بیوستھا (انتظام) کی جا سکتی ہے، اور شانتی بیوستھا (نظم امن) قائم رکھی جا سکتی ہے۔''

اسی طرح ایس۔ ایس۔ پی فیض آباد کا یہ بیان سارے معاملہ کو قطعی طور پر طے کر دیتا ہے:

''او' و 'پی' تالے رہیں یا نہ رہیں، میں وہاں کی سُرکشا بیوستھا سپھلتا پوروک (حفاظت کا انتظام کامیابی کے ساتھ) کر سکتا ہوں، وہاں کی سُرکشا 'او' و 'پی' گیٹ کے تالوں سے ہی نہیں ہے، مجھے آوشیکتا (ضرورت) پڑنے پر وہاں سُرکشا قائم کرنے کا ادھیکار (اختیار) رہنا چاہیے۔''

تو یہ واضح ہوا کہ مورتیوں کی حفاظت یا نظم و ضبط اور امن کے قیام کے لیے 'پی' اور

دو پھاٹکوں پر تالے لگانا ضروری نہیں ہے، اس سے غیر ضروری طور پر مدعی اور اس کے فرقہ
کے دوسرے لوگوں کو اشتعال دلانا ظاہر ہوتا ہے، یہ ضرورت بھی ظاہر نہیں ہوتی کہ دیوتاؤں
اور عقیدت مندوں کے درمیان ایک مصنوعی رکاوٹ پیدا کی جائے۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں متصادم فریق گذشتہ ۳۵ سالوں سے غیر فیصلہ شدہ
صورت حال کے اسیر ہیں۔

کچھ لوگوں نے زمانہ کے کسی ایک واقعہ کی بنا پر اپنی عقل و دانش سے یہ خیال کیا کہ 'بی' اور
'سی' پھاٹکوں پر تالے لگا دیے جائیں، لیکن تب سے کسی نے یہ پرواہ نہیں کی کہ دیکھے آیا ان
دروازوں کے بدستور بند رہنے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں، فریقین کی سماعت گذاری کے بعد
یہ واضح ہوتا ہے کہ تالے کھولے جانے کی صورت میں اور یاتریوں کے لیے درشن اور پوجا
کرنے کی اجازت دینے کے بعد دوسرے فرقہ یعنی مسلمانوں کی حیثیت حد تصور تک بھی
متاثر نہیں ہوتی۔

یہ امر غیر متنازعہ ہے کہ مذکورہ جگہ فی الحال عدالت کے عمل دخل میں ہے، اور
گذشتہ ۳۵ سال سے ہندو پوجا کرنے کا غیر محدود حق رکھتے چلے آئے ہیں۔ جیسا کہ عدالت
کے احکام ۱۳۵ اور ~~۱۹۵۱ء~~ (۱۹ر جنوری ~~سنہ۵۰ء~~، ۳ر مارچ ~~سنہ۵۱ء~~) سے
ظاہر ہے۔

اگر ہندو ایک محدود پابندی کے ساتھ گذشتہ ۳۵ برس سے پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں تو اگر
'بی' اور 'سی' پھاٹکوں کے تالے کھول دیے جائیں تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے میرے سامنے یہ بیان دیا کہ مسلم فرقہ کے افراد کو متنازعہ جگہ پر نماز ادا
کرنے کی اجازت نہیں ہے، ان کو وہاں جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اگر حالات یہی ہیں تو پھر تالوں کے ہٹا دینے کے نتیجہ میں نظم وضبط کے مسائل کھڑے ہونے کی نوبت نہیں آئے گی، یقینی طور پر جائے نزاعی کے اندر کا معاملہ ہے، موجودہ اپیل اس حکم کے خلاف ہے، جو ایسی درخواست پر دیا گیا جو کہ آرڈر ۳۹ کے مفہوم میں اسی طرح آتی ہے جیسے کہ ضابطہ دیوانی کی دفعہ ایس/۱۱۵ کے تحت آتی ہے۔

تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس۔ پی فیض آباد کے ان مثبت بیانات کے بعد کہ نظم وضبط کی صورت حال دوسرے ذرایع سے بھی قابو میں رکھی جا سکتی ہے، اور اس کے لیے ان دروازوں پر تالے بند رکھنا ضروری نہیں ہے، ان تالوں کا بدستور بند رہنا صحیح نہیں۔

لہٰذا اس اپیل میں ایک وزن ہے۔

یہ اپیل منظور کی جاتی ہے اور مدعا علیہم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ فی الفور پھاٹک 'او' اور 'پی' کے تالے کھول دیں، وہ مدعی یا اس کے فرقہ کے افراد پر درشن کرنے یا پوجا کرنے میں کسی طرح مانع یا مزاحم نہ ہوں، اور نہ رکاوٹ ڈالیں۔

بہر کیف مدعی علیہم نظم وضبط کو قابو میں رکھنے کے لیے اور یاتریوں کے داخلہ کی باقاعدگی کے لیے حالات کے تحت کسی بھی آزادانہ اقدام کے مجاز ہوں گے۔

اپیل کے مصارف مقدمہ کے فیصلہ کے تابع ہوں گے (مسلم انڈیا انگریزی اپریل ۱۹۸۶ء انگریزی متن کا ترجمہ)

تبصرہ | اس فیصلہ پر عام تبصرہ یہ ہے کہ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۸۵ء تک کے مقدمہ میں بابری مسجد کو مسجد ہی تسلیم کیا گیا، ۱۹۳۶ء میں یہ باضابطہ مسجد کی حیثیت سے رجسٹرڈ کرائی گئی، سنی سنٹرل وقف بورڈ کے ماتحت یہ مسجد مسجد کی حیثیت سے کر دی گئی، اور مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ تالا بند ہونے سے پہلے اس میں مسلمان برابر نمازیں ادا کرتے رہے، لیکن فاضل جج نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا۔

اور عام طور پر یہ قانونی اعتراض بھی ہوا کہ فیض آباد کے منصف صدر کے فیصلہ کے خلاف کوئی اپیل

نہیں کی جا سکتی، مگر خلاف قانون اس کے خلاف اپیل کی گئی، اور اپیل کرنے والا پہلے کسی مقدمہ میں مدعی نہیں ہوا تھا، لیکن اس کی درخواست ڈسٹرکٹ جج نے اپنی عدالت میں داخل کر لی اس مقدمہ میں جو مدعی علیہم تھے، ان کی سماعت کے لیے ان کو نہیں بلایا گیا، حتی کہ سنی سنٹرل وقف بورڈ کو کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں دیا گیا، اور پھر سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ جب یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں پیش تھا تو اس کے ماتحت عدالت کو اس مقدمہ کی سماعت کا حق نہیں تھا۔ ڈسٹرکٹ جج کا فیصلہ یک طرفہ تھا، اس کے نتائج سے بے خبر ہو کر اس کا نفاذ اسی روز کر دیا گیا۔

مسلمانوں نے اس فیصلہ کے خلاف تین درخواستیں دیں، لیکن جج نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ معاملہ اب ضلع انتظامیہ سے متعلق ہے۔

ہندوؤں میں خوشی اور مسلمانوں میں ماتم

بابری مسجد کا تالا کھولا گیا تو ہزاروں ہندو پوجا پاٹ کے لیے مسجد میں داخل ہو گئے، اس کا منظر ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا گیا، پوری ریاست میں ہندوؤں نے خوشی میں چراغاں کیے، مسلمانوں نے اپنے گھروں پر غم میں سیاہ جھنڈے لہرائے، ہندوؤں کی طرف سے فتح و کامرانی میں جلسے ہوئے، جلوس نکالے گئے، تو مسلمانوں کی جانب سے ماتمی جلوس نکلے، ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہندو مسلمان ایک قوم نہیں ہیں، بلکہ الگ الگ دو قومیں ہیں۔

یو۔ پی کے مسلم ممبران اسمبلی کا میمورنڈم

ڈسٹرکٹ جج کے فیصلے کے خلاف ۱۶ر فروری ۱۹۸۶ء کو اترپردیش اسمبلی کے مسلم ممبروں نے یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ کے سامنے ایک میمورنڈم پیش کیا، جس میں انھوں نے اس طرح فریاد کی:

"ہم درج ممبران اسمبلی آنجناب کی توجہ بابری مسجد اجودھیا ضلع فیض آباد سے متعلق مندرجہ ذیل امور کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں، جسے آج کل سرکاری ذرائع ابلاغ تک رام جنم بھومی

یا جنم استھان کے نام سے پکار رہے ہیں، ہماری استدعا ہے کہ آنجناب فوری ایسے اقدامات کریں جن سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کا قوم کے سیکولر اور جمہوری کردار پر اعتماد بحال ہو

(۱) یہ کہ معتبر کتب تاریخ بشمول تزک بابری کے بموجب بابر نے اجودھیا کے کسی مندر کو مسمار نہیں کیا، اور مبینہ بابری مسجد بابر کے ایک کمانڈر نے ایک خالی جگہ میں بنائی تھی اور اسے گذشتہ ساڑھے چار سو سال سے بابری مسجد کے نام سے جانا جاتا رہا ہے، کسی مندر کو منہدم کر کے اس کے کھنڈر پر کسی مسجد کے بنائے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا، آئین اکبری اور عالمگیر نامہ ان دونوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

(۲) یہ کہ ۱۸۸۵ء میں ایک شخص رگھوبیر داس نے خود کو جنم استھان کا مہنت بتا کر سب جج فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ ۲۸۰/۶۱ ۱۸۸۵ء) دائر کیا اور دعویٰ کیا کہ مسجد سے علیحدہ ایک چبوترہ شرقاً غرباً ۲۱ فٹ اور شمالاً جنوباً ۱۷ فٹ جنم استھان ہے، وہاں کوئی عمارت نہیں ہے لہٰذا اسے اور دوسرے پجاریوں کو موسم گرما میں گرمی سے، موسم سرما میں سردی سے اور برسات کے موسم میں بارش سے سخت پریشانی ہوتی ہے، اس لیے اس چبوترہ پر مندر بنانے کی اجازت دی جائے'
۱۹ جنوری ۱۸۸۵ء کی اسی درخواست میں پیراگراف ۳ میں کہا گیا تھا کہ مارچ اپریل ۱۸۸۳ء میں ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے بعض مسلمانوں کی طرف سے اعتراض کیے جانے کی وجہ سے مجوزہ مندر بنانے کی اجازت نہیں دی ہے۔

(۳) یہ کہ اسی مقدمہ (۲۸۰/۶۱ ۱۸۸۵ء) کو ۲۴ دسمبر ۱۸۸۵ء کو سب جج فیض آباد نے خارج کر دیا، اور جب ایشو مسٹر پجٹ کی تو لکھا کہ گوپال سہائے امین کے تیار کردہ نقشۂ نظری کے مطابق "مسجد اور چبوترے کے درمیان ایک دیوار ہے"...... اور ظاہر ہے کہ چبوترے اور مسجد کے درمیان علیحدہ علیحدہ حد بندی ہے، اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ حالیہ

تنازعات سے پہلے حکومت نے وہاں ایک حد بندی لائن بنادی تھی، اس فیصلہ میں یہ بھی درج ہے کہ "اس کے گرد مسجد کی ایک دیوار ہے، جس پر لفظ "اللہ" لکھا ہے، اگر چبوترے پر ایسی جگہ میں مندر بنایا گیا تو سنکھ اور گھنٹیوں کی آواز گونجے گی، جبکہ ہندو اور مسلمان دونوں اس راہ سے گذر رہے ہوں گے، اس لیے اگر ہندوؤں کو یہاں مندر بنانے کی اجازت دی جاتی ہے تو ایک نہ ایک دن فساد کھڑا ہوجائے گا، اور ہزاروں آدمی مارے جائیں گے" اور یہ کہ "اس موقع پر مندر تعمیر کرنے کی اجازت دینا فساد اور قتل وغارت کی بنیاد ڈالنا ہوگا، اس لیے ..... حکمت عملی کے پیش نظر اور انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ درخواست منظور نہیں کی جانی چاہیے" یہ جج ایک پنڈت صاحب تھے، جن کا نام پنڈت ہری کشن تھا۔

(۴) متذکرہ بالا فیصلہ اور ۲۴ دسمبر ۱۸۸۵ء کے حکم کے خلاف کی گئی اپیل ۲۶ مارچ ۱۸۸۶ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فیض آباد نے خارج کر دیا۔ (بحوالہ اپیل دیوانی ۲۷ سن ۱۸۸۶ء مہنت رگھوبیر داس بنام سکریٹری آف اسٹیٹ وغیرہ)

(۵) یہ کہ بابری مسجد کے کچھ حصوں کو ۱۹۳۴ء کے فرقہ وارانہ فساد میں نقصان پہونچا تھا جسے حکومت نے مرمت کرا کے حسب سابق بنوا دیا تھا۔

(۶) یہ کہ ۲۶ فروری ۱۹۴۴ء کے سرکاری گزٹ میں کمشنر اوقاف نے اسے سنی وقف قرار دیا۔

(۷) یہ کہ سن ۱۹۶۰ء کے ضلع بند رجسٹر میں بھی اسے بابری مسجد دکھایا گیا۔

(۸) یہ کہ اس دستاویزی ثبوت کی بنیاد پر مسجد موصوف اور اس کے آس پاس کی زمین یو۔پی سنٹرل وقف بورڈ میں یو پی مسلم ایکٹ ۱۹۳۶ء کے مطابق وقف ۲۶ فیض آباد کی حیثیت سے درج ہے۔

(۹) یہ کہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک مسجد مذکور میں بے روک ٹوک نماز ہوتی تھی، ۲۲ر
۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں شری رام چندر جی کی مورتی خفیہ طور پر مسجد کے اندر رکھ
دی گئی، یہ بات شری جے۔ این۔ اگروال ڈپٹی کمشنر فیض آباد کے تحریری بیان مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۵۰ء
سے ظاہر ہوتی ہے، جو انھوں نے ریاستی حکومت کی جانب سے سول جج فیض آباد کی عدالت میں
مقدمہ ۲۳ سن ۱۹۵۰ء کے ذیل میں جنوری ۱۹۵۱ء کو دیا تھا، جس کے فریق شری پرم ہنس رام چندر
داس اور ظہور احمد وغیرہ تھے، اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ ریاستی حکومت نے
متنازعہ عمارت کو ہمیشہ سے بابری مسجد کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے، نہ کہ شری رام چندر جی کے مندر کی
حیثیت سے، لیکن یکم فروری ۱۹۸۶ء کو دفعتہً ضلع مجسٹریٹ اور ایس پی فیض آباد نے مقدمہ نمبر ۲
سن ۱۹۵۰ء پر منصف صدر فیض آباد کے ۲۸ر جنوری ۱۹۸۶ء کے فیصلہ کے خلاف متفرقہ دیوانی اپیل
نمبر ۶ سن ۱۹۸۶ء منجانب رمیش چند پانڈے بنام ریاست اتر پردیش و دیگران پر دیے گئے،
فیصلہ پر حقیقت کے بالکل خلاف اسٹینڈ لیا، یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورۂ بالا رمیش چند پانڈے
نہ اس مقدمہ کے فریق تھے اور نہ مقدمہ نمبر ۲ سن ۱۹۵۰ء میں فریق بنائے گئے تھے۔

(۱۰) یہ کہ یہاں بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ مقدمہ نمبر ۲ سن ۱۹۵۰ء کے مدعی شری گوپال سنگھ
وشارد عرصہ ہوا انتقال کر چکے اور ان کی جگہ اب تک کسی دوسرے کو مدعی نہیں بنایا گیا ہے، اس
صورت میں مقدمہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے، اور قانونی طور پر یہ مقدمہ ۲۵ر جنوری ۱۹۸۶ء کو
یا یکم فروری ۱۹۸۶ء کو عدالت میں قابل سماعت ہی نہ تھا، اس لیے اس مقدمہ پر مسجد کے تالے
کھولنے یا درشن اور پوجا پاٹ پر سے پابندی اٹھانے کا حکم دیا ہی نہیں جا سکتا تھا، لیکن تعجب کی
بات ہے کہ ریاستی قانونی مشیر اور ضلع مجسٹریٹ اور ایس۔ ایس۔ پی نے (جو عدالت میں موجود
تھے) مقدمہ کے اس پہلو پر قطعاً توجہ نہ کی، ایسا لگتا ہے کہ پہلے سے منصوبہ بندی کے تحت ضلع انتظامیہ نے

یکم فروری سنہ۱۹۸۶ء کو یہ حکم اس لیے حاصل کیا گیا کہ احتجاج کرنے والی اکثریت کے ایک گروہ کو خوش کیا جائے، اور یہ بات حلق سے نہیں اترتی کہ یہ کام ریاستی اور مرکزی حکومت کی پہلے سے منظوری اور اعلیٰ افسران اور ارباب حل و عقد کے مشورہ اور سازش کے بغیر ہوا ہوگا۔

(۱۱) یہ کہ جس طریقہ پر یکم فروری سنہ۱۹۸۶ء کا مذکورہ بالا حکم مسلمانوں کے غیاب اور مسلمانوں کو فریق بنائے بغیر اور بعض مسلمانوں کی اپیل کی پرواہ کیے بغیر جو تاریخ مذکور پر فیصلہ کی افواہ سن کر عدالت میں آگئے تھے، دیا گیا ہے، اس نے تمام ملک کے مسلمانوں کو تشویش و پیچ میں ڈال دیا، اور حکومت اور عدلیہ پر ان کے اعتماد کو زبردست ٹھیس لگی، یہ بات اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہے کہ اس اپیل سنہ۱۹۸۶ء میں سنی سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ اور دوسرے مدعیان کو جنھوں نے مقدمہ نمبر ۱۲ سنہ۱۹۶۱ء میں اس مسجد کو اپنی تولیت اور قبضہ میں لینے کے لیے سول جج فیض آباد کی عدالت میں دائر کیا تھا (جو ابھی تک غیر فیصلہ شدہ ہے) فریق نہیں بنایا گیا، اور نہ انھیں اس بارے میں کوئی نوٹس دیا گیا، اور یہ حکم مورخہ ۱ر فروری سنہ۱۹۸۶ء کو ان کی عدم موجودگی میں سنا دیا گیا، حالانکہ مذکورہ مقدمہ نمبر ۱۲ سال سنہ۱۹۶۱ء وہ بنیادی مقدمہ ہے جس کے ساتھ اس جائداد سے متعلق تین دوسرے مقدمے بشمول مقدمہ نمبر ۲ بابت سنہ۱۹۵۰ء بھی ملحق ہیں۔

(۱۲) یہ کہ مسجد کا تالا کھول دیے جانے اور اسے پوجا کے لیے واگذار کرنے سے سارے ملک کے مسلمانوں میں ہیجان پھیلا ہوا ہے، انھیں زبردست جھٹکا لگا ہے، اور وہ سراسیمہ و حیران ہیں، اس لیے ہم آپ سے استدعا کرتے ہیں کہ مسجد کے تقدس کی بقا اور حفاظت نیز مسلمانوں کا ملک کے عدالتی نظام اور اس کے سیکولر کردار اور قوم کے جمہوری ڈھانچہ پر اعتماد بحال کرنے کے لیے فوری تدارک کی اقدام کریں۔

لہٰذا ہم ریاستی سرکار سے بلا تاخیر مندرجہ ذیل اقدامات کا مطالبہ کرتے ہیں:

(۱) بابری مسجد اور اس سے متعلقہ وقف کی جائداد کو تحفظ دے کر علی حالہ رکھا جائے جیسی کہ وہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو تھی اور اس کی دیواروں وغیرہ کی مرمت کرائی جائے، اور اسے محفوظ کر دیا جائے۔

(۲) وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل وغیرہ کے اشتعال انگیز نعروں کا نوٹس لیا جائے، ان کے روکنے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں، نیز اس سلسلہ میں مجرمین کو سزائیں دی جائیں۔

(۳) مسجد کے اندر ہونے والی پوجا پاٹ فوری روک دی جائے اور مسجد کے اندر رکھی گئی مورتیوں کو وہاں سے ہٹوایا جائے۔

(۴) مسلمانوں کو مذکورۂ بالا بابری مسجد میں بغیر کسی مزاحمت کے نماز پڑھنے اور مسجد کا اہتمام و انصرام کرنے کی اجازت دی جائے۔

(۵) مسجد کا قبضہ کسی قانون کے ذریعہ یا دائر شدہ مقدمات کو جلد از جلد فیصلہ کے ذریعہ مسلمانوں کو واپس دلایا جائے۔

مخلصان

(۱) محمد مسعود خان (۲) قاضی کلیم الرحمٰن (۳) شفیق الرحمٰن برق (۴) محمد اعظم خان (۵) قاضی محی الدین (۶) عبد الوحید قریشی (۷) امیر عالم خان (۸) خورشید احمد (۹) عبد الودود (۱۰) ضیاء حسین انصاری (۱۱) فرید محفوظ قدوائی (۱۲) فضل الباری (۱۳) فصیح الرحمٰن خان عرف من خان (۱۴) حاجی محمد حیات (۱۵) رضوان الحق (۱۶) محمد عقیل (۱۷) مستحد علی خان (بشکریہ الحسنات اردو ڈائجسٹ بابری مسجد نمبر)

بعض ہندوؤں کی غیر دانشورانہ سرگرمیاں

اس قضیہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پڑھے لکھے ہندوؤں کو یہ احساس رہا کہ یہ جو الزام ہے کہ بابر نے رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر ایک مسجد بنوائی، وہ کسی مستند اور معاصر تاریخ کے حوالہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، اس لیے

اس کے کچھ چابک دست اہل قلم نے اس کی بھی کوشش شروع کردی، کہ اس بات کو معاصر تاریخوں کے حوالہ سے ثابت کیا جائے، جس کی ایک مثال ذیل میں درج کی جاتی ہے:

یوپی کے مشہور اخبار پاینیر کی چار اشاعتوں یعنی ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ ر فروری ۱۹۸۶ء میں ایک مضمون بڑی جلی سرخیوں کے ساتھ شایع ہوتا رہا جس کو پڑھ کر عام ناظرین یہ سمجھیں گے کہ یہ مضمون بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس میں کالم نگار کا بیان ہے کہ "مغل شاہنشاہ بابر نے رام جنم بھومی کو ۱۵۲۸ء میں بابری مسجد میں بدل دیا، لیکن ایسا کرنے میں اس کو ہندوؤں کی پانچ شرطیں منظور کرنی پڑیں، جیسا کہ توجک بابری کے ص ۵۳۲ پر ہے" (پاینیر ۱۱ ر فروری ۸۶ء ص ۱) مغل بادشاہوں کے عہد میں توجک بابری کے نام سے تو کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اگر اس سے مراد تزک بابری ہے تو پھر ایسے اہل قلم کو کوئی تاریخی تحریر لکھنے کا حق نہیں، جو توجک بابری اور تزک بابری میں تفریق نہ کر سکے، اس مضمون میں اس کتاب کے ص ۵۳۲ کا جو حوالہ دیا گیا ہے، وہ معلوم نہیں کون سی تزک بابری ہے، یہ ترکی زبان میں قلمبند ہوئی جو کسی بھی ہندوستانی مورخ کی دسترس سے باہر ہے۔

اس کا ترجمہ فارسی میں اکبر کے عہد میں عبد الرحیم خان خانان نے کیا جو اب تک نہیں چھپا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ اے۔ ایس۔ بیورج نے کیا جس کا نام اس نے وہی 'بابر نامہ ان انگلش' رکھا، اس کا ترجمہ اردو میں بھی تزک بابری اردو 'معروف بہ بابر نامہ' کے نام سے ہوا، پاینیر کے کالم نگار نے اگر تزک بابری کے انگریزی ترجمہ کا حوالہ دیا ہے تو میرے سامنے اس کی پہلی اور دوسری جلدیں ہیں، جو سنہ ۱۹۲۲ء میں چھپیں، اور یہی علمی حلقوں میں پڑھی جاتی ہیں، اس کے ص ۵۳۲ پر ایسی باتیں نہیں لکھی گئی ہیں جو کالم نگار نے لکھی ہیں، انگریزی ترجمہ کرتے وقت اس میں ترکی نسخے کے صفحات بھی درج کر دیے گئے ہیں، جو ۳۸۲ پر ختم

ہو جاتے ہیں، اردو ترجمہ ۳۹۴ صفحات پر مشتمل ہے، یہ تو نہیں معلوم اس کا ترجمہ ہندی میں ہوا ہے یا نہیں، کالم نگار کو وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ آخر کس تزک بابری کا وہ حوالہ دے رہے ہیں؟ ہم ہندوستان کے مورخین اور محققین کی طرف سے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ تزک بابری کے ص ۲۳۵ کے حوالہ سے جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے، اور اگر صحیح ہے تو وہ یہ بتائیں کہ کون سی تزک بابری کا یہ حوالہ ہے۔

کالم نگار نے اپنے ناظرین کو یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ رام جنم بھومی مندر کو منہدم کر کے بابر نے مسجد کیسے بنائی، ان کا بیان ہے کہ بابر نے رانا سانگا سے پہلی جنگ آگرے کے پاس فتح پور سیکری میں کی، اس وقت اودھ پور کی سلطنت اجودھیا تک پھیلی ہوئی تھی، اس پہلی جنگ میں وہ شکست کھا گیا، تو بھاگ کر اجودھیا چلا گیا، یہاں آکر وہ دو مسلم صوفی بزرگوں جلال شاہ اور خواجہ کجل عباس قلندر موسیٰ (عاشقان) سے ملا، اول الذکر بزرگ نے اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کیں، جس کے بعد بابر نے فتح پور سیکری کی دوسری لڑائی جیت لی، وہ اجودھیا آیا، جلال شاہ کی دعاؤں کا صلہ دے کر اپنی ممنونیت کا اظہار کرنا چاہا تو جلال شاہ نے یہ خواہش ظاہر کی، کہ رام جنم بھومی کو گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی جائے، بابر نے ان کی خواہش پوری کی۔

کالم نگار نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ خواجہ کجل عباس (قزلباش) اور جلال شاہ دونوں مہاتما شیا نند جی کے چیلے تھے، اس وقت رام جنم بھومی کا نظم ونسق ان ہی کے سپرد تھا، یہ دونوں اپنے گرو کے شہزادوں کے ساتھ مسلمان ہو گئے تھے، اور وہ مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئے، جلال شاہ نے بابر سے کہا کہ رام جنم بھومی مندر ایک پوتر اوتاری جگہ ہے، اس کی جگہ پر ایک چھوٹا نیا شہر آباد کر کے مسلمانوں کے لیے ایک 'خرد مکہ' بنایا جائے، بابر نے اپنے فوجی سردار میر باقی (میرباقی) کو حکم دیا کہ اس کی جگہ مسجد بنائی جائے، میر باقی نے حکم کی تعمیل

شروع کی، مگر مسجد کے لیے دن میں جو دیوار اٹھائی جاتی وہ رات میں گر جاتی، میر باقی نے بابر کو اجودھیا آنے کی دعوت دی، تاریخ میں ہے کہ بابر نے یہاں آکر سادھوؤں اور مہاتماؤں کی پانچ باتیں منظور کر لیں، جیسا کہ توزک بابری (تزک بابری) میں لکھا ہے۔

جو باتیں بابر نے منظور کیں وہ یہ تھیں: (۱) مسجد کا نام سیتا پاک ہوگا (۲) اس میں مینار نہیں ہوگا (۳) مسجد یعنی رام جنم بھومی کے پاس ہندوؤں کے لیے پوری کرما بھی بنایا جائے گا، (۴) اس کا بڑا پھاٹک صندل کا ہو (۵) ہندوؤں اور مہاتماؤں کو اس کے اندر پوجا کی آزادی ہو، اور مسلمان اس میں صرف جمعہ کی نماز پڑھیں، کالم نگار یہ بھی لکھتا ہے کہ رام جنم بھومی کی خصوصی محراب پر فارسی کے کتبے ہیں، اور کچھ منا (؟) زبان میں بھی ہیں، ان دونوں سے ظاہر ہے کہ یہ سیتا پاک ہے۔ اس کا شمالی حصہ پھر سے بنایا گیا، اور اب تک سیتا پاک کے نام سے مشہور ہے۔

کالم نگار کے بیان کے مطابق یہ ساری باتیں تزک بابری میں درج ہیں، وہ تزک بابری کے ان صفحات کی نشاندہی کریں جہاں سے یہ ساری تفصیلات لی گئی ہیں، ورنہ ہندوستان کے سارے مورخوں کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہوگا کہ یہ ساری باتیں من گھڑت ہیں، جن کا تعلق نہ تزک بابری اور نہ کسی مستند تاریخ سے ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ بابر اور رانا سانگا کی لڑائیاں فتح پور سیکری میں ہوئیں، یہ بھی درست نہیں کہ یہاں دو لڑائیاں لڑی گئیں، صرف ایک لڑائی کنواہہ کے میدان میں ہوئی جس میں بابر کامیاب رہا، اس بات میں افسانویت ہے کہ بابر پہلی جنگ ہارا تو اجودھیا آیا اور پھر یہاں کے بزرگوں کی دعائیں لے کر گیا، تو کامیاب رہا، اور پھر واپس آیا تو مسجد بنائی، اور پھر ہندوؤں سے سمجھوتہ کیا، تزک بابری میں بابر نے اپنی زندگی کے تمام جزوی واقعات لکھے ہیں، اتنے اہم واقعہ اور سمجھوتہ کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، وہ اودھ

ضرور آیا، مگر وہ پورب کے افغان سرکشوں کو صرف دبانے کے لیے یہاں پہونچا، وہ اس سلسلہ میں چین تیمور سلطان، شیخ بایزید تردی بیگ، قوج بیگ، بابا چہرہ، باقی شقاول، لکھنؤ، گومتی گھاگھرا اور سرور وغیرہ کا تو ذکر کرتا ہے، مگر رام جنم بھومی، جلال شاہ اور خواجہ کجل شاہ کے نام تک نہیں لیتا (ترجمۂ تزک بابری اردو، ص ۳۰ - ۳۲۹، بابر نامہ از اے۔ ایس بیورج، ...... ص ۶۰۲ - ۶۰۱ سنہ ۱۹۲۲ء ایڈیشن) بابر یہاں مسلمانوں ہی سے لڑنے آیا تھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ علاقے ان کے زیر نگین تھے، پھر معلوم نہیں کالم نگار نے یہ کیسے دعویٰ کیا کہ اجودھیا تک رانا سانگا کی حکومت تھی،

ابوالفضل کی اکبر نامہ، ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، خافی خاں کی منتخب اللباب، سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ یا مغلوں کے دور کی کسی تاریخ میں رام جنم بھومی کے انہدام کا ذکر نہیں ہے، الیٹ اینڈ ڈاؤسن کی ہسٹری آف انڈیا جلد چہارم میں تزک بابری کے کچھ اقتباسات ہیں، یہ دونوں مورخین مسلمانوں کی مندر شکنی کے واقعات کی تلاش میں رہتے ہیں، انھوں نے بھی تزک بابری کے اقتباسات میں رام جنم بھومی کے انہدام کا ذکر نہیں کیا ہے، ولیم ارسکن اور راشبروک ولیم نے بابر پر دو کتابیں لکھی ہیں، جو یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہیں، ان میں بھی اس انہدام کا ذکر نہیں ہے۔

اے۔ ایس۔ بیورج نے تزک بابری کا جو ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اس میں اس کے حواشی اور تعلیقات میں نہ جلال شاہ، نہ خواجہ قزل شاہ اور نہ ہندوؤں سے بابر کے سمجھوتے کا ذکر ہے۔

ہم گذشتہ اوراق میں تو لکھ چکے ہیں کہ پانیر کے کالم نگار نے دیوان اکبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اکبر نے بیربل اور ٹوڈرمل کو بھیج کر ہندوؤں کے سادھوؤں اور مہاتماؤں سے یہ

سمجھوتہ کیا، کہ وہ مسجد کی بائیں جانب ایک چبوترہ بنالیں جو رام مندر کہلائے گا، یہ ہندوؤں کے پوجا پاٹ اور درشن کے لیے ہوگا، اکبر کو ایسا اس لیے کرنا پڑا کہ ہندوؤں نے کم سے کم بیس[۲۰] مرتبہ اس پر حملے کیے تھے، جیسا کہ دیوان اکبری سے ظاہر ہے، ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ اکبر کے زمانہ میں دیوان اکبری کے نام سے کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی، اگر اس سے آئین اکبری مراد ہے تو ہم پھر ہندوستان کے مورخوں کی طرف سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آئین اکبری کے کسی صفحہ پر ایسی باتیں نہیں لکھی گئی ہیں، اس میں اودھ یعنی اجودھیا کے ذکر میں جو کچھ ہے، اس کو ہم گذشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں۔

پانیر کے کالم نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے رام مندر کو ساتویں رمضان کو بالکل منہدم کر دیا، اس کے لیے عالمگیر نامہ ص ۹۲۰ کا حوالہ دیا ہے، میرے سامنے عالمگیر نامہ ہے جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہوئی ہے، یقین کامل کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے ص ۹۲۰ پر ایسی کوئی تحریر نہیں ہے، اور نہ اس کے کسی اور صفحہ پر اس چبوترہ کے انہدام کا ذکر ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ بابری مسجد کی صرف اتنی حقیقت ہے کہ بابر کے ایک امیر میر باقی نے (جس کو کالم نگار نے میر بانکی لکھا ہے) اجودھیا میں مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بنوا دی تھی جس کا تعلق رام جنم بھومی کے انہدام سے کچھ بھی نہیں، اس مسجد پر قبضہ کرنے میں سیاسی استحصال کا رنگ پیدا ہوگیا ہے، مگر اس رنگ کو پیدا کرنے میں غلط قسم کی تحقیقات اور تعبیرات سے ہندوستان کے علم، تحقیق اور تاریخ کے معیار کو بدنام نہ کیا جائے۔

جناب سید شہاب الدین کی طرف سے مسلم مجلس مشاورت کا میمورنڈم	۱۵ر فروری ۱۹۸۶ء کو مسلم مجلس مشاورت نے وزیر اعظم کے سامنے یہ میمورنڈم پیش کیا:۔

مسلمانان ہند کی جانب سے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، بابری مسجد اجودھیا مسلمانوں کے سپرد کیے جانے کے سلسلہ میں مندرجۂ ذیل گذارشات پیش کرنا چاہتی ہے،

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، یکم فروری ۱۹۸۶ء کو ڈسٹرکٹ جج فیض آباد نے ایک پرائیوٹ شخص کی درخواست پر آرڈر پاس کرتے ہوئے بابری مسجد کے صحن کا تالا کھولنے کی اجازت دیدی تاکہ ہندو مسجد کے اندر آزادی کے ساتھ پہونچ کر پوجا کرسکیں، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے غالباً ریاستی حکومت کے ایما پر یہ فیصلہ دیا ہے، اس طرح یہ مسجد قلم کی ایک جنبش کے ساتھ ہندوؤں کے قبضہ میں دے دی گئی، جبکہ سنہ ۱۹۵۰ء میں حق ملکیت کا جو مقدمہ دائر کیا گیا تھا، وہ ہنوز غیر فیصلہ شدہ ہے، ایک تاریخی مسجد کو جو ۴۵۰ سال قبل بنائی گئی تھی، ایک عدالتی فیصلہ کے ذریعہ ہندو مندر میں تبدیل کر دیا گیا۔

جناب وزیر اعظم! جیسا کہ ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اپنے حلفیہ بیان میں کہا ہے، کہ ۲۲ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کی رات میں مسجد کے اندر چوری چھپے بت رکھ دیے گئے، اور اس طرح امن و قانون کا مسئلہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ نے ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۴۵ کے تحت ایک آرڈر ۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کو پاس کرتے ہوئے اس احاطہ کے دعویداروں سے کہا کہ وہ تحریری بیان داخل کریں، چنانچہ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۱۴۶ کے تحت جائداد مذکور کو سرکاری قبضہ میں رکھنے کا فیصلہ سٹی مجسٹریٹ نے صادر کر دیا، جب تک کہ سماعت کی اہل کسی عدالت کا فیصلہ اس کی ملکیت کے بارہ میں نہ ہو جائے، اس کے ساتھ میونسپل بورڈ فیض آباد و اجودھیا کے چیرمین کو مہتمم قرار کر دیا گیا، اور انھیں جائداد کی نگرانی اور اس کے نظم و انصرام کے لیے ایک منصوبہ پیش کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس طرح سنہ ۱۹۵۰ء میں یہ جائداد مسلمانوں کے ہاتھ سے لے لی گئی، بت نہیں ہٹائے گئے اور بیرونی صحن میں ہندوؤں کے مذہبی

رسومات پابندی سے ہوتے رہے، اب ۱۹۸۶ء میں یہ جائداد باقاعدہ طور پر ہندوؤں کے حوالہ کردی گئی۔

محترم وزیر اعظم! ڈسٹرکٹ جج کا آرڈر ہندوستانی عدالتی نظام کی تاریخ میں بے مثال ہے، اس کا غیر قانونی ہونا ریکارڈ ہی سے ظاہر ہے، اس لیے کہ:

(۱) یہ معاملہ عدالت کے سامنے ہے، کیونکہ ایک اپل ساعت عدالت میں چار مقدمے پڑے ہیں، جن پر فیصلہ باقی ہے۔

(۲) درخواست دہندہ کو اس سلسلہ میں کوئی حق مداخلت نہیں پہونچتا، اور دفعہ ۱۴۶ کے تحت تمام ہندوؤں کو اس بات کا حق حاصل نہیں، اور مسجد تک رسائی کا حق سنہ ۱۹۵۰ء کے آرڈر کے تحت صرف ایک ہندو پروہت کو دیا گیا ہے۔

(۳) کسی بھی مسلمان کو یہاں تک کہ مقدمہ سے منسلک فریق کو بھی ساعت میں شامل نہیں کیا گیا۔

(۴) اس مسجد یا کسی بھی مسجد میں پوجا پاٹ کرنے سے مسلمانوں کے احساس پر کیا گذرے گی، اس کا مطلق خیال نہ رکھا گیا۔

(۵) سنی وقف بورڈ اتر پردیش کو جس کے ریکارڈ میں یہ مسجد وقف جائداد کی حیثیت سے رجسٹرڈ ہے، اس سلسلہ میں مطلع بھی نہیں کیا گیا، ساعت میں شریک کرنا تو دور کی بات ہے۔

(۶) مہتمم جس نے غالباً اندرونی دروازہ میں تالا لگایا تھا، اسے بھی نہیں بلایا گیا، اور اس طرح نگرانی اور نظم و انصرام کے حقوق کی خلاف ورزی کی گئی۔

(۷) یہ آرڈر اس بنیاد پر پاس کیا گیا کہ تالا کھول دینے سے ضلع حکام کے لیے امن و قانون کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا، مگر اس حقیقت کو فراموش کر دیا گیا کہ مسجد کو سچ مچ مندر میں تبدیل کر دینے کا مطلب ان لوگوں کے نزدیک فتح ہوگی جو تالا توڑ دینے کی دھمکی دے چکے تھے۔

(۸) سرکاری قبضہ میں تالے یا بغیر تالے کے پڑی ہوئی جائداد تک رسائی کے سوال کو بھی ٹھکرا دیا گیا،

(۹) اب اس طرح جو بات عمل میں لائی جا چکی ہے، اس سے دونوں فرقوں کے درمیان پرانے قبضہ کو طے کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گا، اور اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا گیا۔

تاہم محترم وزیر اعظم! ضلع حکام نے اس آرڈر پر بڑی نرمی اور عجلت کے ساتھ عمل درآمد کیا، اور حکومت اتر پردیش نے، جو مدعیٰ علیہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور جس کے خلاف یہ آرڈر جاری کیا گیا، اس نے آرڈر کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی، اور نہ آرڈر پر غور کرنے کے لیے کہا، اور نہ التواء کے لیے اپیل کی، اس کے بعد اس فتح کا جشن منایا گیا، شہروں اور گاؤں میں جلوس نکالے گئے، دیے جلائے گئے۔ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں، اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں اور توہین آمیز نعرے لگائے گئے، اور اسی کے ساتھ دھمکیاں دی گئیں کہ مزید مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کر دیا جائے گا، مسلم فرقہ ان سب واقعات کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا رہا اور اشتعال انگیزیوں کے باوجود صبر سے کام لیتا رہا۔

محترم وزیر اعظم! اس بات کی کوئی معاصرانہ شہادت نہیں کہ بابری مسجد کسی ایسی زمین پر بنائی گئی تھی جو کبھی مندر سے تعلق رکھتی تھی، جسے جان بوجھ کر مسمار کر دیا گیا تھا، اور اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ شری رام چندر جی کی جائے پیدائش پر وہ بنائی گئی تھی، ایک لحاظ سے پورا اجودھیا ان کا جائے پیدائش ہے، مگر خصوصی طور سے ان کی جائے پیدائش ۲۰ × ۲۰ پیمائش کے پلیٹ فارم کی شکل میں ہے جو اصل مسجد سے بالکل الگ اور مختلف ہے، اور اس مقام کو صدیوں سے عزت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا، اس مقام کی حد بندی انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی حکام نے کر دی تھی اور ایک باڑ باندھ دی تھی جس کے اندر مسجد تھی، جہاں مسلمان عبادت کر سکتے تھے، جب کہ باڑ کے باہر اونچے پلیٹ فارم پر ہندوؤں کو پوجا پاٹ کرنے کی اجازت دی گئی۔ (پی کارنیگی سٹلمنٹ آفیسر و قائم مقام کمشنر فیض آباد کا بیان تحصیل فیض آباد ضلع فیض آباد لکھنؤ ۱۸۷۰ء کے ایک تاریخی نوشتہ میں)

معزز وزیراعظم! اب یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ جنم استھان' بابری مسجد سے بالکل الگ ہے، مگر آر۔ ایس۔ ایس اور وشو ہندو پریشد کی قیادت میں جارحیت پسند ہندو عناصر نے بابری مسجد پر قطعی قبضہ کرنے کے لیے پچھلے دو برسوں سے مہم چلا رکھی تھی، اور ان کی مبینہ دلیل یہی ہے کہ مسجد جائے پیدائش پر کھڑی ہے، ان لوگوں نے جان بوجھ کر حقیقت حال کو گڈمڈ کر کے مذہبی ہسٹیریا پیدا کیا ہے۔

محترم وزیراعظم! اس مہم کا مقصد مذہبی نہیں بلکہ سیاسی ہے، اس کا مقصد سیکولر نظام کو درہم برہم کرنا، قانون کی حکمرانی کو تباہ و برباد کرنا، مسلمانوں کو ذلیل کرنا، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان منافرت پھیلانا، اور ہندوؤں کی جارحانہ برتری کے لیے ملک کے حکمرانوں کو فاشسٹوں کے حوالہ کرنے کے لیے تیار کرنا ہے، بدقسمتی سے عاملہ اور عدلیہ میں ہمدرد عناصر موجود ہیں، اور سیاسی پارٹیوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو آپس میں ہاتھ ملا چکے ہیں اور جمہوری دباؤ کے تحت سیکولر سیاسی پارٹیاں خاموشی کو ترجیح دے رہی ہیں۔

جناب وزیراعظم! ہم اس ناجائز قبضے سے مسلمانوں کے ذہنی کرب کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے، سیکولر نظام میں ان کا یقین ختم ہو گیا ہے، عدلیہ میں ان کے اعتماد کو جھٹکا لگا ہے، دستوری ضمانت اپنے معنی کھو چکی ہے، اور قانون کی حکمرانی ایک دھوکہ ثابت ہو رہی ہے، سیاسی نظام جارحیت پسندی کے تابع ہوتا جارہا ہے، ذرائع ابلاغ بشمولیت دوردرشن یک طرفہ پروپیگنڈہ میں مصروف ہیں، اس لیے کہ وہ تصویر کو اس قدر توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں کہ شناخت مشکل ہے، جیسے کہ وہاں مسجد کا وجود ہی نہ تھا، اور یہ مسلمان ہی ہیں جو ہندوؤں کو مندر میں پوجا پاٹ کرنے سے روک کر جھگڑا کھڑا کر رہے ہیں۔

محترم وزیراعظم! آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ایک فرقہ مکمل طور پہ بے بس، مد محرومیت کا

شکار ہو تو اس کے نتائج کتنے تباہ کن ہو سکتے ہیں، اگر وہ ملک کے نظام سے الگ ہو گیا تو یا تو وہ منجمد ہو جائیں گے یا غیر قانونی طریقہ کار اپنالیں گے، لہٰذا ہم بڑے ادب کے ساتھ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ کو اس عظیم ملک کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس معاملہ میں مداخلت کر کے صورت حال کو سنبھالنا نہیں چاہیے، اور ایک فرقہ کا وقار بحال کرنے اور آزادئ مذہب کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے؟

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت آپ سے اپیل کرتی ہے کہ اگر یکم فروری ۱۹۸۶ء کا آرڈر آپ کو غلط اور غیر ضروری معلوم ہو جس نے خواہ مخواہ بحران پیدا کر دیا ہے تو آپ اس آرڈر کے خلاف حکومت اتر پردیش کو آرڈر کے خلاف اپیل کرنے کو کہیں، یا درخواست گذارنے کو کہیں، تاکہ سابقہ صورتحال برقرار رہے، اور ملکیت کا فیصلہ صادر ہونے سے قبل کسی بھی تعمیراتی تبدیلی سے روکا جائے، مشاورت آپ سے یہ بھی اپیل کرتی ہے کہ مرکزی حکومت اس مقدمہ میں خود مداخلت کرے، کیونکہ اس مقدمہ کے بہت دوررس نتائج برآمد ہوں گے، اور اس سے ملک میں شدید ردعمل ہوگا، آپ اٹارنی جنرل آف انڈیا کو مقرر کریں کہ وہ مرکزی حکومت کی پوری نمایندگی کرے۔

جناب وزیر اعظم! مشاورت، کلکتہ ہائی کورٹ میں آپ کی بروقت مداخلت کے لیے بے حد شکر گذار ہے، اور پوری توقع رکھتی ہے کہ آپ ایک بار پھر تنگ ولانہ سیاسی مصلحتوں اور عددی دباؤ سے اوپر اٹھ کر مسلمانوں میں ایسی تھوڑی سی امیدیں پیدا کر دیں کہ وہ مساوی وقار کے ساتھ ایک آزاد ملک میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے زندگی گذار سکیں۔

بحوالہ مسلم انڈیا اردو، مارچ ۱۹۸۶ء

وزیر اعظم کی خدمت میں مسلم ممبران پارلیمنٹ کا میمورنڈم، ۳ر مارچ ۱۹۸۶ء	بابری مسجد اجودھیا کے سلسلہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فیض آباد کے حالیہ فیصلہ نے مسلمانوں کو گہرے صدمہ سے دوچار

کر دیا ہے، اور ملک میں ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے جس کو اگر دانائی سے حل نہ کیا گیا تو پھر وہ صورت ایک ایسے فتنہ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے جو ناقابل اصلاح ہو، لہٰذا ہم مسلمان ممبران پارلیمنٹ کی یہ خواہش ہے کہ جناب محترم کے سامنے حقایق کو پیش کر دیں، ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ ازراہِ کرم اس معاملہ میں فوری مداخلت کریں اور مسلمانوں میں اس اعتماد کی فضا بحال کریں کہ دستور ہند کے الفاظ و معانی کے مطابق وہ ایک سیکولر ریاست میں مساوی درجہ کے شہری کی حیثیت سے مذہبی آزادی سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں،

سب سے پہلے ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ بابری مسجد کی تاریخی اور قانونی حیثیت کے سلسلہ میں درج ذیل حقایق پُر زور اور ناقابل تردید شہادتوں پر منحصر ہیں:

(۱) بابری مسجد کی تعمیر بادشاہ بابر کے دور حکومت میں ہوئی، اسے بابر کے ایک گورنر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں ایک خالی قطعہ زمین پر تعمیر کرایا۔

(۲) بین الاقوامی سطح پر معروف اور مشہور تاریخ داں اے۔ ایس۔ بیورج جنھوں نے تزک بابری کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور اس پر قیمتی حواشی ترتیب دیے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب میمارس آف بابر جلد دوم ص ۶۰۸۔۹، طبع لندن ۱۹۲۲ء میں بابر کے سفر اودھ کا ذکر کیا ہے، انھوں نے ایک ایک لمحہ کی تفصیلات اس میں درج کی ہیں، لیکن کہیں یہ ذکر نہیں کیا کہ بابر اجودھیا میں داخل ہوا، یہ ذکر ضرور ملتا ہے کہ شیخ بایزید جو اودھ کا گورنر تھا اور باغی ہو گیا تھا، بابر نے اس کی جگہ باقی بیگ تاشکندی (میر باقی) کو اودھ کے گورنر کی حیثیت سے مقرر کیا اور چلا گیا، ۱۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کے وقت ڈسٹرکٹ کمشنر فیض آباد کی ایک رپورٹ سے بھی اسی حقیقت کا مزید اثبات ہوتا ہے، اس رپورٹ کو انھوں نے اتر پردیش وقف کے چیف کمشنر کے سامنے داخل کیا تھا، علاوہ ازیں اے۔ ایس۔ بیورج کی معلومات کے مطابق مسجد کی دیواروں پر لکھی ہوئی تحریروں سے بھی یہ

ثابت ہوتی ہے، فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن کے ایک فیصلہ مورخہ ۲۴ ردسمبر ۱۸۸۵ء (مقدمہ نمبر ۲۸۰/۶۱) سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ (پنڈت ہری کشن کے فیصلہ کی ایک کاپی اس میمورنڈم کے ساتھ منسلک ہے)

(۳) ڈسٹرکٹ ڈپٹی کمشنر کی مذکورۂ بالا رپورٹ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دو گاؤں بھارے پور اور شولا پور کو ۱۸۶۴ء میں لگان سے آزاد قطعۂ اراضی قرار دیا گیا تھا، تاکہ بادشاہ بابر کے منظور کیے ہوئے ساٹھ روپیے سالانہ کی رقم کے عوض ان گاؤں سے مسجد کا انتظام کیا جائے، بابر کی اس رقم کو بعد میں شاہ اودھ نے بڑھا کر ۳۰۲ روپیے تین آنے چھ پائی کر دیا تھا

(۴) ۱۸۸۵ء میں ایک شخص مہنت رگھوبیر داس نے فیض آباد کے سب جج کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر کیا (مقدمہ ۲۸۰/۶۱ ۱۸۸۵ء) اور یہ مطالبہ کیا کہ رام جنم استھان کا چبوترہ بغیر عمارت اور چھت کے ہے، اور پجاریوں کو موسمی اثرات مثلاً سخت گرمی، تیز بارش اور شدت کی سردی کی وجہ سے زبردست دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس نے مذکورہ چبوترہ ۲۱ × ۱۷ فٹ پر پوجا کرنے کے لیے ایک مندر بنانے کی اجازت چاہی۔

یہ مقدمہ ۱۹ رجنوری ۱۸۸۵ء میں داخل کیا گیا، اس کے پیراگراف میں یہ شکایت بھی درج ہے کہ اپریل ۱۸۸۳ء میں فیض آباد کے کمشنر نے فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے مذکورہ مندر کی تعمیر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

(۵) فیض آباد کے سب جج پنڈت ہری کشن نے ۲۴ ردسمبر ۱۸۸۵ء میں مذکورہ مقدمہ نمبر ۲۸۰/۶۱ ۱۸۸۵ء کو اپنے ایک حکم کے ذریعہ خارج کر دیا، اس حکم کی بنیاد عدالت کے ایک امین مسٹر گوپال سہائے کا تیار کردہ متنازعہ جگہ کا نقشہ تھا، عدالت نے یہ دیکھا کہ مسجد اور چبوترہ کے درمیان ایک دیوار ہے، اور یہ واضح ہے کہ چبوترہ اور مسجد کے درمیان جدا جدا حدبندیاں ہیں، اس سچائی

مزید سہارا اس حقیقت سے بھی ملا کہ حکومت نے نزاع سے پہلے حد بندی کی ایک دیوار وہاں تعمیر کی تھی عدالت نے یہ بھی دیکھا کہ گردونواح میں مسجد کا ایک کنواں ہے، اور عمارت پر لفظ "اللہ" لکھا ہوا ہے، اور اگر ہندوؤں کو مندر بنانے کی اجازت دے دی جاتی ہے تو کسی نہ کسی دن آپس میں فوج داری ہوگی اور ہزاروں لوگ مارے جائیں گے، اور اس مرحلہ پر ایک مندر کی تعمیر کی اجازت دینا گویا فساد اور قتل کی بنیاد رکھنا ہے، اس لیے داد رسی کا جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ نامنظور کیا جاتا ہے۔

(۶) مذکورہ فیصلہ مورخہ ۲۴ ر دسمبر ۱۸۸۵ء کے خلاف ایک اپیل (سول اپیل نمبر ۲۷، ۱۸۸۶ء) مہنت رگھوبیر داس نے سکریٹری آف اسٹیٹ اور دوسروں کے خلاف ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کی عدالت میں داخل کی، ڈسٹرکٹ جج نے اپنے حکم مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۸۸۶ء کے ذریعہ اس کو خارج کر دیا،

(۷) ۱۹۳۴ء کے فرقہ وارانہ فساد میں مسجد کو نقصان پہونچایا گیا، اور اس وقت حکومت یو. پی نے اس کی مرمت کرائی۔

(۸) ۱۸۶۰ء کے مثل بندر جسٹر میں مذکورہ مسجد بہ حیثیت مسجد بابری کے درج کی گئی۔

(۹) وقف کمشنر کی ایک رپورٹ میں جو گورنمنٹ کے گزٹ مورخہ ۲۶ ر فروری ۱۹۴۴ء میں شایع ہوئی، اس مسجد کو سنی وقف میں ہونا ظاہر کیا گیا۔

(۱۰) مذکورۂ بالا حقایق کی بنا پر یوپی سنی سنٹرل وقف بورڈ نے مذکورہ مسجد کو وقف نمبر ۲۶ فیض آباد، یوپی مسلم وقف ایکٹ ۱۹۶۰ء کے تحت بحیثیت وقف درج کیا۔

(۱۱) ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک مسلمان اس مسجد میں پابندی سے نمازیں ادا کرتے رہے، اور یہ ۲۲ر ۲۳ ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب تھی جبکہ ایک مسلم مخالف متعصب ہجوم نے یہ زبردستی مسجد پر قبضہ کر لیا، اور یہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر کے. کے. نائر کی چشم پوشی کی وجہ سے ہوا جن کو اس

ناپاک واقعہ کے بعد مستعفی ہونا پڑا، اور پھر شری رام چندر جی کی مورتیاں خفیہ طور سے مسجد میں رکھ دی گئیں
اجودھیا پولیس اسٹیشن پر اس رات ڈیوٹی پر تعینات کانسٹیبل شری ماتا پرشاد نے فوراً ایف آئی آر درج
کرائی، اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ مورتیاں خفیہ طور پر مسجد کے اندر ۲۲ر ۲۳ر دسمبر کی درمیانی رات میں رکھی
گئیں۔ (ایف آئی آر کی ایک کاپی ساتھ میں منسلک ہے)

(۱۲) ۲۳ر دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کو فیض آباد اور اجودھیا میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گئی، اور مسجد کو دفعہ
۱۴۵ کے تحت قرق کر لیا گیا۔

(۱۳) ۱۶ر جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو گوپال سنگھ ویشارد نے فیض آباد کے منصف صدر کی عدالت
میں مقدمہ نمبر ۱ پیش کیا، اس بات کی جانب توجہ دلانا مناسب ہوگا کہ مورخہ ۲۴ر اپریل سنہ ۵۰ء کو
مقدمہ نمبر ۱ میں ڈپٹی کمشنر فیض آباد شری جے این اگروال کی جانب سے سول جج فیض آباد کی عدالت
میں تحریری بیان داخل کیا گیا جس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ شری رام چندر جی کی مورتیاں شرانگیزی
سے مسجد کے اندر رکھ دی گئیں، اسی طرح اسٹیٹ گورنمنٹ کی جانب سے آر۔ ایس نمبر ۲ سنہ ۱۹۵۰ء
میں تحریری بیان داخل کیا گیا۔ (اس میمورنڈم کے ساتھ ان دونوں بیانات کی کاپیاں منسلک ہیں)
اسی طرح ایک اور مقدمہ نرموہی اکھاڑے کی جانب سے بھی داخل کیا گیا، اور آخر میں ایک چوتھا
مقدمہ یوپی سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ کی جانب سے سنہ ۱۹۶۱ء میں مقدمہ نمبر ۱۲ کی حیثیت سے داخل
کیا گیا، یہ تمام چاروں مقدمات قائم ہوئے، اور رجسٹرڈ مقدمہ نمبر ۱۲ سنہ ۱۹۶۱ء جسے وقف بورڈ نے
داخل کیا تھا، اس کو رہنما مقدمہ بنایا گیا۔

مذکورۂ بالا ان تمام بیانات سے جنھیں صوبائی حکومت نے داخل کیے، ان سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ صوبائی حکومت برابر مذکورہ عمارت کو بابری مسجد کی حیثیت سے شمار کرتی رہی، نہ کہ شری رام چندر
کے مندر کی حیثیت سے۔

(۱۴) مسجد کے اہتمام (ریسیورشپ) سے متعلق معاملہ میں الٰہ آباد ہائی کورٹ نے رہنما مقدمہ نمبر ۱۲ سنہ ۱۹۶۱ء کی فائل روک رکھی ہے، اور یہ اب تک اسی عدالت کی لکھنؤ شاخ میں پڑی ہوئی ہے۔

(۱۵) ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء کو اچانک ایک شخص امیش چندر پانڈے وکیل عدالت فیض آباد نے منصف صدر فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ ۲ سنہ ۱۹۵۰ء کے سلسلہ میں ایک درخواست دی جس کا منشا یہ تھا کہ ڈی ایم اور ایس پی فیض آباد کو ہدایت کی جائے کہ وہ متنازعہ جگہ سے تالے ہٹا لیں تاکہ وہ اور ہندو فرقہ کے دوسرے افراد وہاں پوجا کر سکیں، ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء کو فاضل منصف نے یہ حکم دیا کہ یہ درخواست مقررہ وقت پر دی جائے، کیونکہ مقدمہ کی فائل ہائی کورٹ میں پیش ہے۔

(۱۶) بہر حال منصف صدر کے مذکورہ فیصلہ کے خلاف ایک اپیل ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء کو ڈسٹرکٹ جج کے سامنے پیش کی گئی، اس کی سماعت یکم فروری سنہ ۱۹۸۶ء کو ہوئی، اسی تاریخ کو چند مسلمانوں کو ان کارروائیوں کا علم ہوا تو انھوں نے ایک درخواست دی کہ مقدمہ کے ایک فریق کی حیثیت سے ان کی سماعت نہیں ہو رہی ہے، مقدمہ میں امیش چندر پانڈے نے کسی مسلمان کو فریق نہیں ٹھہرایا تھا، ان مسلمانوں نے جو اصل مقدمات میں پہلے سے ہی فریق تھے، انھوں نے بھی اس سماعت میں فریق بننے کے لیے تحریک کی، مگر ساری درخواستیں ڈسٹرکٹ جج نے غیر منصفانہ طریقہ سے مسترد کر دیں، اور بے محل طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس پی کے بیانات لیے، ان لوگوں نے شرارت پسند لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کر دیا، چنانچہ ان لوگوں کے ایسے غیر عقلی اور غیر جمہوری بیانوں کی بنیاد پر کہ مسجد کے تالے کھول لیے جانے کی صورت میں نظم و ضبط کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا ڈسٹرکٹ جج نے اپیل منظور کر لی اور ڈی ایم اور ایس پی کو ہدایت کی کہ وہ متنازعہ جگہ سے تالا ہٹا دیں، چنانچہ

تالا اسی روز تقریباً سوا پانچ بجے شام کو توڑ دیا گیا۔

(۱۷) اس کی طرف توجہ دلانا بھی برمحل ہوگا کہ یہ حکم جسے مسلمانوں کو نظرانداز کرکے سازش کرکے حاصل کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل نقائص پر مبنی ہے:

(۱) مدعی جس نے یہ اپیل داخل کی وہ گذشتہ مقدمات میں کبھی ایک فریق نہیں رہا، اس طرح اسے عدالت میں حاضر ہونے کا مسلمہ حق ہی نہیں۔

(۲) وہ مسلمان جو گذشتہ اصل مقدمات میں فریق تھے، اور جنھوں نے اس مقدمہ میں فریق بنائے جانے کی درخواست بھی کی تھی، ان کو سماعت کا موقع نہیں دیا گیا۔

(۳) اپیلوں پر کبھی بھی بیانات ریکارڈ نہیں کیے جاتے ہیں، جیسا کہ اس ڈسٹرکٹ جج نے غلط طور پر کیا۔

(۴) منصف صدر کا جاری کردہ بیان اپیل کے لائق نہیں تھا، کیونکہ اس نے اس وقت تک خود کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

(۵) اپیل کی سماعت ڈسٹرکٹ جج نے کی، اور یک طرفہ احکام جاری کیے گئے، اور اسی دن ان کا نفاذ بھی کر دیا گیا۔

(۶) اور سب سے بڑھ کر ایسا کوئی حکم نافذ کیا ہی نہیں جا سکتا، جبکہ اصل مقدمہ کی فائل الٰہ آباد ہائی کورٹ (لکھنؤ شاخ) میں پڑی ہو۔

(۱۸) ڈسٹرکٹ جج کے فیصلہ نے موجودہ صورت حال کو پیدا کیا کہ بلوے فسادات میں ملک کے بہت سے حصوں میں کرفیو کا نفاذ ہے، اور اجتماعی گرفتاریاں ہیں، اس حکم نے ایسی صورتحال کو پیدا کیا جس میں مسلمانوں کا عدالتی نظام پر بھروسہ اور اعتماد ہل کر رہ گیا ہے۔

(۱۹) ہم شکوہ کرنے پر بھی مجبور ہیں کہ نیشنل ٹیلی ویژن کو بھی اس تنازعہ میں ایک فریق تصور کریں

کیونکہ اس نے مسجد میں ہندو پجاریوں کے داخلہ کو ٹیلی ویژن پر دکھایا اور متنازعہ جگہ کو رام جنم بھومی کہہ کر ظاہر کیا، آل انڈیا ریڈیو نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔

(۲۰) مسلمانوں کے پُر امن اور جمہوری احتجاج کو ہندو اکثریتی فرقہ نے بُرا مانا اور ان کو اس سلسلہ میں نظم و ضبط کے انتظامیہ سے عملی تعاون حاصل رہا۔

(۲۱) جس چیز نے ہم کو سب سے زیادہ دکھ دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ قدریں جو ہندوستان کے سیکولر اور جمہوری طریقۂ زندگی کو واقعۃً برقرار رکھ کر متمول کر سکتی ہیں وہ تیزی سے پستی میں جا رہی ہیں، اگر ہندوستان کو مضبوط اور متحد رہنا ہے تو کچھ نہ کچھ فوری طور پر کیے جانے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں ہم محترم وزیر اعظم کی توجہ میں ایک مجاہد آزادی اور فیض آباد کے سینیر کانگریسی لیڈر جناب اکشے برہمچاری کی وہ پُر زور فریاد بھی لانا چاہتے ہیں جس نے اس وقت کے یو پی کے وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تھی، اس میں چند ہندو مفسدوں کی چیرہ دستی اور غارت گری کی جانب اشارہ تھا، جو بابری مسجد کو بزور مندر میں بدل دینا چاہتے تھے، شری اکشے برہمچاری کی یہ فریاد "راہ فرض پر" کے نام سے میمورنڈم کے ساتھ منسلک ہے۔

اس پس منظر میں ہم مسلمان ممبران پارلیمنٹ آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ براہ کرم مندرجہ ذیل مطالبات کے لیے مناسب قدم اٹھائیں:

(۱) یہ کہ آپ براہِ مہربانی اس معاملہ میں فوری مداخلت کریں، اور مسلمانوں کے لیے بابری مسجد کی بازیابی کے لیے فوری اقدام کریں۔

(۲) یہ کہ ایک رٹ پٹیشن حکومت یو پی کی جانب سے ہائی کورٹ میں داخل کی جائے جو اس فیصلہ کے خلاف ہو جسے فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج نے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو صادر کیا ہے

(۳) یہ کہ ڈسٹرکٹ جج نے خود اپنے فیصلہ مورخہ یکم فروری میں تسلیم کیا ہے کہ انتظامیہ

نظم وضبط کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی بھی آزادانہ قدم اٹھا سکتی ہے، اس لیے بابری مسجد کی جو صورتحال ۳۱ رجنوری ۱۹۸۶ء سے پہلے تھی، وہ برقرار کر دی جائے۔

(۴) متنازعہ جگہ سے متعلق تمام غیر فیصلہ شدہ مقدمات کو چھ مہینوں میں فیصل کر دیا جائے۔

(۵) مختلف پارٹیوں کے نمائندہ ممبران پارلیمنٹ کا ایک وفد اجودھیا جاکر بابری مسجد کا معائنہ کرے، اس وفد کو ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں کہ وہ متنازعہ جگہ کا ایک نقشہ تیار کرے اور مسجد کے فوٹو بھی لے تاکہ مسجد کی واقعی جائے وقوع کے ریکارڈ میں وہ درج ہوں۔

(۶) سرکاری وسائل وذرایع ابلاغ کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ متنازعہ جگہ کو رام جنم بھومی کے نام سے نہ ذکر کریں۔

اس میمورنڈم پر لوک سبھا کے حسب ذیل ممبروں کے دستخط ہیں:

(۱) قاضی جلیل عباسی (۲) اکبر جہاں بیگم (۳) سرفراز احمد (۴) عابدہ احمد (۵) اختر حسن (۶) عبدالحنان انصاری (۷) ابراہیم سلیمان سیٹھ (۸) غلام محمود بنات والا (۹) بشیر۔ بی، (۱۰) حسین دلوائی (۱۱) عبدالرشید کابلی (۱۲) اسلم شیر خان (۱۳) محمد ایوب خان (۱۴) محفوظ علی خان (۱۵) چودھری رحیم خان (۱۶) ذوالفقار علی خان (۱۷) سید شہاب الدین، (۱۸) صلاح الدین اویسی (۱۹) نفیر محمد ای۔ ایس۔ ایم (۲۰) احمد جمیل (۲۱) عزیز قریشی، (۲۲) صلاح الدین (۲۳) پی۔ ایم۔ سعید (۲۴) حافظ محمد صدیق (۲۵) سیف الدین سوز، (۲۶) طارق انور (۲۷) غلام یزدانی (۲۸) زین البشر۔

اور راجیہ سبھا کے مندرجہ ذیل ممبروں کے بھی دستخط ہیں:

(۲۹) سید ہاشم رضا عابدی (۳۰) حیات اللہ انصاری (۳۱) اسرار الحق (۳۲) محمد ہاشم قدوائی (۳۳) ایف۔ ایم خان (۳۴) بی۔ وی۔ عبداللہ کویا (۳۵) اسعد مدنی (۳۶) غلام رسول ماٹو

(۳۷) مرزا ارشاد بیگ (۳۸) رفیق عالم (۳۹) غلام محی الدین شال (۴۰) شمیم احمد صدیقی، (۴۱) راؤ ولی اللہ۔

احتجاجی مظاہرے | بابری مسجد کو مندر بنا دینے پر پورے ملک میں مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی، ان میں ایسا جوش و خروش ابل پڑا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بابری مسجد کی بازیابی کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانی دے دیں گے، ۳۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو یوم احتجاج منایا گیا، تو ہزاروں کی تعداد میں مسلمان گھروں سے جیل جانے کے لیے نکل پڑے، بارہ بنکی میں تو مسلمانوں اور پولیس والوں میں خون ریز تصادم ہوگیا، جس میں تیرہ چودہ افراد گولیوں کا نشانہ بنے، اس سے پورے ملک کی فضا اور بھی مکدر ہوگئی، پہلی بھیت میں بھی ایسا ہی سانحہ پیش آیا، حکومت نے ان شہیدوں کے معاوضے دے کر ان کے پس ماندگان کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی، مگر یہاں یہ واقعہ لکھنے کے قابل ہے کہ بارہ بنکی کی ایک بوڑھی عورت کے ایک جوان لڑکے کے مارے جانے پر حکومت کی طرف سے اس کا معاوضہ دیا جانے لگا تو اس نے کہا کہ کاش میرے اور لڑکے ہوتے جو اس مسجد کے لیے شہید ہو جاتے، تم اپنا معاوضہ واپس لے جاؤ، یا تو میرے لڑکے کو لا کر دو، یا بابری مسجد واپس کر دو، یو۔ پی کی حکومت کی طرف سے یہ بیان شائع ہوا ہے کہ فروری سے اگست ۱۹۸۶ء کے اوائل تک اس ریاست میں اسی بابری مسجد کے سلسلہ میں ۴۵ ہندو مسلمان بلوے ہو چکے ہیں جن میں پانچ بہت بڑے تھے، یہ بیان بی۔ بی۔ سی سے بھی براڈ کاسٹ ہوا۔

ہندوؤں کی تنظیموں کے عزائم | ہندو پریشد کی ایک جنگجویانہ تنظیم کی بات ہے، پھر دھرم استھان مکتی بھی قائم ہوئی، جس کا مقصد یہ ہے کہ کاشی، متھرا اور اجودھیا اور ہندوؤں کے بڑے اور اہم مندر جنھیں بیرونی حملہ آوروں نے تاراج کیا تھا، وہ اب ہندوؤں کے سپرد کیے جائیں، اور پھر بجرنگ دل اس لیے قائم کیا گیا کہ جب تک رام کا نام پورا نہ ہو جائے، یہ دل چین سے نہ بیٹھے۔

مسجد شکنی کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے | اس طرح اگر بابری مسجد کا قضیہ صرف اس لیے اٹھایا گیا ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ مسلمان اپنے دورِ حکومت میں صرف مندروں کو منہدم کرتے رہے، تو پھر یہ لکھنے میں بالکل تامل نہیں کہ ہندوستانی سیاست دانوں کا نہیں بلکہ مورخوں کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو یہ جائزہ لے کہ ہندوستان میں جب سے مسلمان آئے اُس وقت سے اب تک مسلمانوں نے کتنے مندر منہدم کیے، اور ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں، دونوں کے اعداد و شمار سے یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ کون زیادہ قصور وار ہے۔

اب تو صاف اور غیر متعصب ذہن رکھنے والے ہندو مورخین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں جو مندر منہدم کیے گئے وہ یا تو سرکشی کے مرکز یا معصیت کے اڈے تھے، ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے اپنی کتاب پالی ٹکس ان پری مغل ٹائمس میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں بعض مندر بد اخلاقی کے اڈے تھے، ان کے میلوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے، عورتیں بھی وہاں آتی تھیں، اس لیے مندر عبادت گاہ کے بجائے شیطنت کے مرکز بن گئے تھے فیروز شاہ تغلق نے اسلامی اور اخلاقی جذبہ کے تحت ان مخرب اخلاق اڈوں کو منہدم کرا دیا، یہ ایک الگ سوال ہے کہ فیروز شاہ کو عوام کی بد اخلاقی دور کرنے کا حق تھا یا نہیں؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ فیروز شاہ نے جو کچھ کیا اس میں مذہبی جنون کو دخل نہ تھا، بلکہ عوام کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے ایسا کیا، اگر اس میں مندروں کو منہدم کرنے کا جذبہ ہوتا تو ہندوستان کے سارے مندروں کو برباد کرا دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، ذمیوں کے حقوق کی بنا پر تمام مندر محفوظ رہے (ص ۲۴۷)

اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں جو مندر مسلمانوں کے عہد میں منہدم کیے گئے، وہ اس لیے نہیں کہ یہ ہندوؤں کی عبادت گاہیں تھیں، بلکہ اس کے اسباب کچھ اور تھے، جن کا تجزیہ غیر متعصبانہ انداز سے کرنے کی ضرورت ہے، اورنگ زیب مندر شکنی کا سب سے بڑا مجرم قرار دیا جاتا ہے، بطاوی

حکومت کے اشارے سے جدو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب پر جو پانچ جلدیں لکھی ہیں ان میں اس کی مندرشکنی کی تفصیل پورے زور بیان کے ساتھ لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس نے اپنی شاہزادگی اور بادشاہت کے زمانہ میں سارس پور، چنتامن، احمد آباد، اورنگ آباد کے گاؤں ستارا، سوم ناتھ، بنارس کے وشونا تھ، متھرا کے کیسو راۓ مندر اور اجین کے مندر کو منہدم کرایا، ان کی گنتی کی جائے تو ان کی تعداد بارہ تیرہ سے زیادہ نہیں ہوتی، ان مندروں کے انہدام کا ذکر جدو ناتھ سرکار اس طرح کرتے ہیں جیسے اورنگ زیب نے پورے ہندوستان کے مندروں کو منہدم کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا، مگر اس نے اپنی راجدھانی آگرہ اور دہلی کے کسی مندر کو منہدم نہیں کیا، اور حیرت تو یہ پڑھ کر ہوتی ہے کہ وہ پچیس[25] برس تک دکن میں رہا، اور وہاں اجنتا اور الورا ہیں، جو اس کی آخری آرام گاہ سے میل دو میل پر واقع ہیں، ان کو اس نے مسمار نہیں کیا، بلکہ اس کا درباری مورخ اور ماٰثر عالمگیری کا مصنف ان کو نظر زیب سیر گاہیں کہہ کر ان کی تعریف کرتا ہے، (ماٰثر عالمگیری، ص ۲۳۸) اورنگ زیب نے جن مندروں کو منہدم کیا اس کے اسباب کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، ڈاکٹر بی۔ این۔ پانڈے جو آج کل اڑیسہ کے گورنر ہیں، ان کی نظر ہندوستان کی تاریخ پر بڑی اچھی ہے اورنگ زیب نے بلاشبہ وارانسی کے وشونا تھ مندر کو منہدم کرایا، اس انہدام کی نوعیت کی وضاحت جناب بی این پانڈے نے ۲۷ جولائی ۱۹۷۷ء میں راجیہ سبھا کی ایک تقریر میں اس طرح کی، کہ "اورنگ زیب بنگال جا رہا تھا تو وارانسی کے پاس سے بھی گذرا، اس کے جلو میں ہندو راجے بھی تھے انھوں نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ یہاں ایک روز قیام کیا جائے، تاکہ ان کی رانیاں وارانسی جا کر گنگا میں اشنان اور وشونا تھ جی کی پوجا کر سکیں، فوجی کیمپ سے وارانسی پانچ میل دور تھا، اورنگ زیب کے حکم سے فوج متعین کر دی گئی، رانیاں پالکیوں میں روانہ ہوئیں، انھوں نے گنگا میں اشنان کیا، اور وشونا تھ مندر میں پوجا کے لئے گئیں، اور رانیاں واپس آگئیں، مگر کچھ کی

جہارانی لاپتہ تھی، بجلت اس کی تلاش ہوئی، کہیں نہیں ملی، اس گمشدگی پر اورنگ زیب بہت برہم ہوا، اس نے جہارانی کی تلاش میں اپنے اونچے عہدیداروں کو مندر کے اندر بھیجا، انھوں نے دیکھا کہ اس میں گنیش جی کی مورتی دیوار میں نصب ہے، لیکن اس میں حرکت ہوتی رہتی ہے، مورتی اپنی جگہ سے ہٹائی گئی تو اس کے نیچے زینے ایک تہ خانے کے اندر جاتے تھے، لوگوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے جہارانی کو اس تہہ خانہ میں پایا، اس کی عصمت ریزی ہو چکی تھی اور وہ رو رہی تھی، راجاؤں نے اورنگ زیب سے فریاد کی، بڑا اہم مسئلہ تھا، اورنگ زیب نے حکم دیا کہ یہ پوترا احاطہ ناپاک کر دیا گیا ہے، وشوناتھ کی مورتی تو کسی اور جگہ منتقل کر دی جائے، لیکن مندر مسمار کر دیا جائے، اور مہنت کو گرفتار کر کے سزا دی جائے، ڈاکٹر پٹابی سیتا رامیہ نے اپنی مشہور کتاب دی فیدرس اینڈ اسٹونس میں اس واقعہ کو پوری سند کے ساتھ لکھا ہے، اور ڈاکٹر پی۔ ایل۔ گپتا نے بھی جو پٹنہ میوزیم کے کیوریٹر رہ چکے ہیں، اس واقعہ کو دہرایا ہے، اورنگ زیب پر یہ تو الزام رکھا جاتا ہے کہ اس نے مندروں کا انہدام کیا، مگر ڈاکٹر بی۔ این۔ پانڈے ہی نے اس کی طرف توجہ دلائی کہ اس نے مہاکلیشور، اجین، بالاجی مندر، چتر کوٹ، اوما نند گوہاٹی، شترنجے کے جین مندروں اور اسی طرح شمالی ہند کے دو سو مندروں اور گرودواروں کو جاگیریں دیں، اس کے ایسے فرامین کی نقلیں ان کے پاس موجود ہیں، اس نے جتنے مندر منہدم کیے ان کے اسباب اسی قسم کے تھے جیسے کہ وشوناتھ مندر کے تھے، یا وہ سازشوں، بغاوتوں اور دوسرے جرائم کے مرکز بن گئے تھے،

پھر جب مندر شکنی کا ذکر ہو تو مسجد شکنی کا بھی ذکر ضرور آنا چاہیے کہ خود ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عروج کے زمانہ میں گجرات میں ہندوؤں نے جا بجا مسجدوں کو توڑ کر ان کی جگہوں پر اپنے گھر بنا لیے تھے، (بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری ج ۲ ص ۵۸)

علی عادل شاہ نے سنہ ۹۷۶ھ میں بیجا نگر کے راجہ رام کو نظام شاہ بحری کے خلاف اپنی مدد کے لیے

بلایا تو بلم راجا نے علی عادل شاہ کے قلمرو کی تمام مسجدیں جلادیں (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۶، لکھنؤ ایڈیشن)
خود جدوناتھ سرکار نے اعتراف کیا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ست نامیوں نے نارنول کو
لوٹ کر اس کی تمام مسجدیں منہدم کردیں (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۲، ص ۲۹۶) اورنگزیب
ہی کے عہد میں بھیم سنگھ نے گجرات میں سو مسجدوں کو جلادیا (اورنگ زیب۔ از ظہیرالدین فاروقی،
ص ۱۲۴) اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد جودھپور کے راجہ جسونت
سنگھ کے لڑکے اجیت سنگھ نے جودھپور کی مسجدیں شہید کرکے ان کی جگہوں پر مندر بنوائے (منتخب
اللباب، از خافی خان ج ۲، ص ۲۳۱) اسی کتاب میں گذشتہ اوراق میں ذکر آیا ہے کہ اجودھیا میں
ہندوؤں نے تین مسجدیں مسمار کردیں، سکھوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں جو ہزاروں مسجدیں برباد
کیں اس کی داستان الگ ہے (تفصیل کے لیے تاریخ لاہور از کنہیا لال کپور ص ۱۰۱ - ۱۲۵ دیکھی
جاسکتی) ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسجدوں کی جو بے حرمتی اور بربادی کی گئی، اس کی الم کی
اب بھی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے، ۱۹۰۶ء میں حکومت ہند نے برنی کمیٹی مقرر کی تھی، اس کی
رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک صرف دہلی کی تقریباً ایک سو چھہتر[۱۷۶] مسجدیں ایسی تھیں جن کے
تصرف سے مسلمان محروم تھے، ان پر یا تو حکومت یا ہندوؤں کا قبضہ تھا، اور اب تک واگذاشت
نہیں ہوئی ہیں، دہلی مسلمان بادشاہوں کا بھی دار السلطنت رہا، لیکن کسی مستند حوالہ سے یہ ثابت
نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہاں ایک سو چھہتر[۱۷۶] مندروں کے تصرف سے ہندو محروم کر دیے گئے
تھے، ۱۹۶۹ء میں مغربی بنگال اسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ صرف کلکتہ میں انسٹھ[۵۹]
مسجدیں ایسی ہیں جن کے قبضے سے مسلمان نہ صرف محروم ہیں بلکہ ان پر ہندوؤں کا تصرف ہے اور
بعض مسجدوں کو گوبر سے لیپا جاتا ہے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں
چلایا جاسکتا ہے کہ صرف ایک شہر کے انسٹھ[۵۹] مندروں کی ایسی بے حرمتی کی گئی، اور اخباروں میں برابر

ذکر آیا ہے کہ دہلی سے پاکستان کی سرحد تک نو ہزار مسجدیں ایسی ہیں جو غیر مسلموں کے تسلط میں ہیں۔

مسلمانوں کی مذہبی رواداری | مسلمانوں کے دورِ حکومت میں البیرونی نے اپنی کتاب الہند اور ابوالفضل نے اپنی آئینِ اکبری میں ہندو مذہب کو جس ہمدردی، رواداری اور فراخ دلی سے لکھا ہے، پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آج تک کسی ہندو اسکالر نے اسلام کو اس ہمدردی، فراخ دلی اور رواداری سے نہیں سمجھا، بلکہ مذہبی حیثیت سے اس پر کچھ نہ کچھ الزام رکھ دیتے ہیں ہندو دانشوروں کو ذہنی لذت ملتی ہے، خود راماین اور رام چندر سے مسلمانوں نے بڑی دلچسپی لی۔

مسلمانوں میں راماین اور رام چندر کا احترام | اکبر نے اپنے زمانہ میں راماین کا ترجمہ فارسی میں کرایا، اس کی تفصیل خود راقم نے اپنی کتاب بزمِ تیموریہ جلد اول میں اس طرح لکھی ہے :

"۹۹۲ھ یعنی ۱۵۸۴ء میں ملا عبدالقادر بدایونی نے شاہی حکم کے بموجب راماین کا ترجمہ شروع کیا، اور ۹۹۶ھ یعنی ۱۵۸۷ء میں تمام کیا، ملا صاحب راماین کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں پچیس ہزار اشلوک ہیں، ہر اشلوک ۶۵ حرفوں کا ایک نقرہ ہے، اس میں اودھ کے رام چندر کا قصہ ہے جن کو رام بھی کہا جاتا ہے، ہندو ان کو اوتار سمجھ کر پرستش کرتے ہیں، اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رام چندر کی بی بی سیتا تھیں، جن پر جزیرۂ لنکا کا راجہ فریفتہ ہو گیا، اس کے دس سر تھے، رام چندر نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرہ پر حملہ کیا، انھوں نے اپنے لشکر میں بے شمار بندر اور اتنے ریچھ جمع کیے کہ ان کا حساب وہم میں بھی نہیں آ سکتا ہے، اور سمندر پر چار کوس کا ایک پل بندھوایا، کہا جاتا ہے کہ بعض بندروں نے ایک جست میں سمندر کو پار کیا، اور بعض بندر ایسے تھے جو سمندر پر چل کر پار ہوئے، رام چندر ایک بندر پر سوار ہو کر پل سے پار ہوئے ایک ہفتہ جنگ کر کے رام چندر نے راون اور اس کی اولاد کو قتل کیا، اس طرح ہزار سال کے ایک خاندان کو برباد کر دیا، لنکا کو راون کے بھائی کے سپرد کر کے واپس آ گئے۔ ہندوؤں کا خیال ہے

کہ رام نے سارے ہندوستان پر دس ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد وفات پائی، ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا قدیم ہے، کوئی جگہ انسان سے خالی نہیں ہے، دنیا پر لاکھوں سال گذر چکے ہیں، وہ آدم کو ابوالبشر کہتے ہیں، جن کو گذرے ہوئے سات ہزار سال ہو چکے، ملا صاحب نے چار سال میں اس کا ترجمہ کر کے اکبر کی خدمت میں پیش کیا تو اس کے آخر میں یہ لکھ دیا ؎

ما قصہ نوشتیم بہ سلطاں کہ رساند   جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

یعنی ہم نے قصہ لکھ کر سلطان تک پہونچا دیا۔

اکبر کو شعر بہت پسند آیا، اس نے پوچھا کہ یہ کتنے جز میں مکمل ہوا؟ تو ملا صاحب نے بتایا کہ پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر جز، اور دوسری بار تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس جز میں تمام ہوا، اکبر نے مصنفوں کے دستور کے مطابق ملا صاحب سے اس پر دیباچہ لکھنے کی بھی فرمائش کی، لیکن انھوں نے اس کے لکھنے سے اغماض کیا، پھر بھی اکبر نے ان کو ایک شال اور گھوڑا انعام میں عطا کیا، مدد معاش کے لیے فرمان بھی جاری کرنے کو کہا، اس ترجمہ کے نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، (بزم تیموریہ ج ۱، ص ۱۷۵ - ۱۱۳)

جہانگیر کے زمانہ میں ملا مسیح نے خود فارسی میں ایک منظوم رامائن لکھی، بزرگان دین میں مرزا مظہر جان جاناں کرشن اور رام چندر دونوں کو مقدس شخصیتیں ملنتے تھے، اور اس کی ہدایت اپنے مریدوں کو دیتے تھے، جیسا کہ حسب ذیل واقعہ سے ظاہر ہوگا، ایک روز مرزا صاحب کے سامنے کسی خواب کا ذکر آیا، کہ ایک صحرا ہے، جس میں آگ جل رہی ہے، کرشن اس آگ میں اور رام چندر کنارے پر کھڑے ہیں، مرزا صاحب نے اس خواب کی تعبیر دی کہ صحرا کی آگ عشق و محبت کی حرارت ہے، کرشن کی زندگی عشق و محبت کی زندگی تھی، اس لیے آگ کے اندر دکھائی دیے، اور رام چندر کی زندگی تیاگ اور ایثار کی زندگی تھی، اس لیے

راہ سلوک میں کنارے کھڑے نظر آئے، پھر فرمایا کہ قرآن میں ہے کہ ہر قریہ میں ایک ڈرانے والا آیا، اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں بھی کوئی منذر آیا ہوگا، ممکن ہے کہ رام چندر اور کرشن نبی رہے ہوں، رام چندر ابتدائی عہد میں دنیا میں بھیجے گئے، جبکہ لوگوں کی عمریں دراز اور ان میں طاقت اور توانائی زیادہ ہوتی، اس لیے انھوں نے لوگوں کی تربیت سلوک کے طریقہ کے مطابق کی (ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص ۲۶۰)

علامہ محمد اقبال کی خواہش تھی کہ وہ راماین کے خاص خاص واقعات کو اپنی شاعری میں منظوم کرلیں، وہ ایسا تو نہ کر سکے مگر رام چندر پر یہ نظم لکھ گئے ہیں:

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند	سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر	رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوتے ہیں ہزاروں ملک سرشت	مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز	اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی	روشن تر از سحر ہے زمانہ میں شام ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوش محبت میں فرد تھا

رام اور راماین کے بعض ہندو نقاد — رام پر اس سے بہتر نظم موجودہ ہندی زبان میں شاید نہ لکھی گئی ہو، مگر عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اب کچھ ایسے ہندو اہل قلم بھی پیدا ہو گئے ہیں جو رام کی شخصیت، راماین کی نوعیت اور خود اجودھیا کے وجود پر ایسے ایسے مضامین لکھ رہے ہیں جن سے ان کا روایتی تقدس اور ان کے ساتھ جو جذباتی لگاؤ ہے وہ مجروح ہو رہا ہے، اور طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔

رام چندر جی کی شخصیت اور اہمیت رامائن ہی سے متعین ہوتی ہے، اس سے پہلے ان کا ذکر کہیں اور نہیں آتا، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ رامائن کب اور کیسے لکھی گئی، آج سے انچاس برس پہلے دارالمصنفین کے رسالہ معارف میں اس پر بحث چھڑی تھی، رامائن کا تجزیہ کرتے ہوئے راج مندری (دکن) کے مسٹر لادی وین کٹا رتنام سابق وائس چانسلر گورنمنٹ ٹریننگ کالج راج مندری نے ایک کتاب "رام مصر کا فرعون" کے نام سے لکھی ہے، اس میں انھوں نے ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ رامائن ایک مصری فرعون رامسیز ثانی کے قصہ سے ماخوذ ہے، خود رام کا نام ہندی الاصل نہیں، بلکہ سامی الاصل ہے، سیریا کے ایک بادشاہ کا یہی نام تھا، رامائن کا دوسرا زبردست کردار سیتا جی ہیں، رامائن کا بیان ہے کہ یہ نام اس لیے پسند کیا گیا تھا کہ جنک نے ہل چلاتے وقت ان کو پایا تھا، بالفاظ دیگر وہ کسی عورت کے بطن سے پیدا نہ ہوئی تھیں، بلکہ وہ دھرتی ماتا کی اولاد تھیں، لیکن سیتا ایک بہت ہی قدیم مصری نام ہے، ؛ ہاں اب بھی دولت مند خواتین کے نام کے ساتھ عزت اور ادب کے لحاظ سے اس کو لگا دیا جاتا ہے، قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد سیتا زینب کہلاتی ہے، وین کٹا رتنام نے اسی طرح رامائن کے اور ناموں کی تطبیق مصری ناموں سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم آثار میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت کیا جائے کہ رام چندر جی نے کسی خطہ پر حکومت کی، یہ ایک مصری کہانی ہے جس کو ہندوؤں کے مزاج کے مطابق ایک مقدس رنگ دے دیا گیا ہے، یہ خیال کہاں تک صحیح ہے، اس سے ہم کو بحث نہیں، مگر لادی وین کٹا رتنام نے اس کی تصنیف کا جو زمانہ متعین کیا ہے اس سے ضرور دلچسپی ہے۔

وین کٹا رتنام کا دعویٰ ہے کہ رامائن میں بودھ مت کے حوالے اکثر جگہ موجود ہیں، مثلاً جب رام اور لکشمن وشوامتر رشی کے ساتھ راکششوں کو قتل کرنے جا رہے تھے اور متھلا پہونچے، تو

گوتم کے سب سے بڑے بیٹے ستانند سے ملاقات ہوئی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ رام چندر جی گوتم بدھ کے بعد ہوئے، کیا یہ صحیح ہے؟ یا رامائن کی یہ روایت صحیح نہیں ہے، اگر اس میں گوتم بدھ کے لڑکے کا ذکر ہے تو یہ تصنیف چھٹی صدی عیسوی کی قرار دی جا سکتی ہے، اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ رام چندر جی حضرت عیسیٰ سے ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے تو پھر رامائن ان کے تین ہزار سال کے بعد لکھی گئی، جو کتاب کسی معاصرانہ یا مستند اثری اور کتبی شہادتوں کے بغیر قلم بند ہوتی ہے اس میں سنی سنائی ہوئی روایتوں کا سہارا زیادہ ہوتا ہے جس میں مورخوں کے نزدیک تاریخیت نہیں ہوتی۔

دین کنار تنام لکھتے ہیں کہ خود رامائن میں ہے کہ نردیہ پہلا شخص ہے جس نے بالمیک کو یہ افسانہ سنایا اس میں اس نے کیسی کیسی رنگ آمیزی کی، اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بالمیک ہندو نہ تھا، کوئی بدیسی نو وارد تھا، رامائن میں یہ بھی ہے کہ نردیہ برہما کا بیٹا تھا جس کو رام کا قصہ سنانے کے لیے برہما نے بالمیک کے پاس آسمان سے بھیجا جس کے بعد وہ پھر آسمان کی طرف چلا گیا، مگر رامائن میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ چترکوٹ میں بالمیک اور رام چندر کی ملاقات ہوئی، رام چندر جی نے اپنا جو قصہ سنایا اسی کو بالمیک نے قلم بند کر دیا، دین کنار تنام لکھتے ہیں کہ اس تضاد کا اندازہ خود مورخین کر سکتے ہیں، دین کنار تنام جو چاہیں لکھیں مگر ہندو رامائن کو ایک آسمانی صحیفہ سمجھتے ہیں تو ہم کو ان کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس پر زیادہ بحث کرنے کا حق نہیں۔

رامائن میں جو عجیب و غریب واقعات لکھے گئے ہیں دین کنار تنام نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، وہ لکھتے ہیں "بال کھنڈ میں سیتا اور رام کی شادی کے وقت جو نسب نامہ دیا گیا ہے وہ یہ کہ وشنو سے برہما جی پیدا ہوئے، برہما کے لڑکے اکش وشو تھے، اکش وشو کے بیٹے دسرتھ تھے، جو رام چندر جی کے باپ تھے، دسرتھ نے ساٹھ ہزار سال تک حکومت کی اور

رام چندر جی گیارہ ہزار برس تک تخت نشین رہے، راون کے دس سر تھے، رام کا حریف مقابل راون تھا، جو راماین کے تمام افراد میں سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے، کیونکہ وہ ایک برہمن اور ویدوں کا مفسر بھی بتایا جاتا ہے، راون کا ماخذ سنسکرت کا لفظ "راؤ" بتایا گیا ہے، جس کے معنی ہیں چلانا یا پکارنا، اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ راون اور شیو میں جنگ ہوئی، راون نے اس پہاڑ کو جس پر شیو جی بیٹھے ہوئے تھے، اکھاڑ کر آسمان کی طرف پھینک دیا، شیو جی نے غصہ میں پاؤں کے انگوٹھے سے پہاڑ کو دبایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ پھر زمین پر آ گیا، اور راون کا ہاتھ اس کے نیچے دب گیا اور وہ چلانے لگا، اور آخر شیو جی نے ترس کھا کر راون کا ہاتھ نکال دیا، اس وقت سے راون شیو جی کا معتقد ہو گیا، اور جب ہی سے راون کہلایا، دس کنٹھ اور دس گریو اس کا لقب ہے، کیونکہ رامائن کے مطابق وہ دس سروں والا انسان تھا، اور جب رام چندر جی سے جنگ ہو رہی تھی تو اس کا ایک سر کٹنے کے بعد اس کی جگہ نیا سر پیدا ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ رام چندر کی تلوار نے ایک سو ایک سر کاٹ ڈالے، اس لڑائی کے ذکر میں ہے کہ بندروں نے رام چندر جی کی حمایت کی، وہ ہمالیہ سے پتھر لاتے تھے، اور آسمان تک لے جاتے تھے، اور سمندر کو ایک جست میں پھاند جاتے تھے، ایسے تمام واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے وین کٹا رتنام لکھتے ہیں کہ یہ خلاف عقل بیانات شاعرانہ تخیل کے لیے تو جائز سمجھے جا سکتے ہیں لیکن تاریخ کیا افسانہ کے معیار سے بھی گر جاتے ہیں، پھر بھی اپنی طرف سے یہ کہتا ہے کہ جب ہندو ان باتوں کو سچ سمجھ کر ان پر مذہبی اعتقاد رکھتے ہیں تو ہمارے لیے اس پر جرح و قدح کی گنجائش نہیں، البتہ اس کی طرف خیال ضرور جاتا ہے کہ اگر رامائن کے مطابق راجہ دسرتھ اور رام چندر جی کی حکومت اکہتّر ہزار سال رہی تو پھر عام روایت جو یہ ہے کہ ان کا زمانہ حضرت عیسیٰؑ سے پچیس ہزار سال پہلے تھا، تو دونوں کی حکومت کو سلسلہ

رکھتے ہوئے ان کا عہد حضرت عیسیٰ سے چھیانوے ہزار سال پہلے رکھنا ہوگا۔

دین کنار تنام یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے آثار الصنادید بھی کوئی ایسی چیز نہیں پیش کرسکتے جس کو رام چندر جی کی یادگار کہا جا سکے، چترکوٹ، رام ٹیک، پنچ وٹی، غرض تمام ایسے مقامات پر جو کہ رام کے گذر گاہ ہونے یا قیام کا شرف حاصل ہوا ہے، سوائے ان مندروں کے جو عقیدت مندوں نے بعد میں تعمیر کر دیے ہیں، بلکہ اکثر مقامات کا وقوع بھی مشتبہ ہے کیونکہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی صوبہ ایسا ہو جہاں کے دو چار مقامات پر رام کا گذرنا مروی نہ ہو، گوداوری کے قریب بہت دور مشرق کی طرف ہٹا ہوا ایک اور مقام "پرناسالہ" نامی بھی رام کی قیام گاہ بتائی جاتی ہے، پرناسالہ اور پنچ وٹی، یہ دونوں مقام وہ ہیں جہاں سے کہا جاتا ہے کہ راون سیتا کو لے گیا، یہ دعویٰ ان تمام مقامات کی فرضی حیثیت پر روشنی ڈالتا ہے، جن کو رام کے سفر و حضر سے منسوب کیا جاتا ہے،

دین کنار تنام یہ بھی لکھتے ہیں کہ وسط ہند کی ایک بڑی سلطنت کوشل نامی دریا سے سرجو کے کنارے تک واقع تھی، اس کا دارالسلطنت اجودھیا تھا، جس کو خود منو نے آباد کیا تھا، اسکے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابل عبور خندق اس کی حفاظت کے لیے تھی، یہاں ایسے ایسے آلات حرب موجود تھے جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل بہت سی منزلیں اور عمارتیں اس کی رونق تھیں، اجودھیا کا شہر دنیا میں جواب نہ رکھتا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دین کنار تنام لکھتے ہیں کہ شہر اجودھیا کی عظمت خوبصورتی اور استحکام کا جو ذکر ہے اس کے حق لیے گواہی دینے والی ایک اینٹ بھی موجود نہیں، اجودھیا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، ممکن ہے کہ یہاں کچھ بدیسیوں نے آکر تو آبادی قائم کرلی ہو اور اس سے رام کی روایت ملک میں پھیل گئی ہو۔

ڈاکٹر شکلا کا ایک مضمون | یہ باتیں پچاس برس پہلے لکھی گئی تھیں جو ممکن ہے کہ آج کل کی تحقیق کے مطابق صحیح ثابت نہ ہوں، مگر ابھی ابھی حال ہی میں دہلی کے ڈاکٹر آر۔ ایل۔ شکلا نے اپنے ایک مضمون میں ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جس سے رامائن اور رام دونوں کی حیثیت مشکوک اور مشتبہ ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں: رامائن میں شروع میں صرف چھ ہزار شلوک تھے، پھر بارہ ہزار اور آخر میں چوبیس ہزار ہو گئے، یہ آج تک پتہ نہیں چلایا جا سکا ہے کہ کن کن لوگوں کی طرف سے یہ اضافے ہوتے گئے، پھر شلوک کے ان اضافوں سے تاریخ مرتب کرنا ممکن نہیں رام چندر جی کا دور مہا بھارت سے بہت پہلے اور حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار سال پہلے بتایا جاتا ہے، مہا بھارت کی لڑائی حضرت عیسیٰؑ سے ایک ہزار سال پہلے ہوئی، پھر رامائن میں جن جگہوں کا ذکر ہے وہاں انسانی آبادی کا نشان ملنا چاہیے اس کی تحقیق کے لئے اتر پردیش میں تین جگہوں پر کھدائی ہوئی، فیض آباد ضلع میں اجودھیا، پھر الہ آباد سے ۳۵ کلو میٹر کی طرف شرنگویر پور اور پھر الہ آباد شہر میں بھاردواج آشرم میں ہوئی، آج سے تقریباً پچیس سال قبل وہاں جو کھدائی ہوئی اس سے وہاں انسانی آبادی کے نشان حضرت عیسیٰؑ سے چھ سو سال سے اوپر کے زمانہ کے نہیں ملے پھر دس سال پہلے وہاں جو کھدائی ہوئی تو حضرت عیسیٰؑ سے سات سو سال پہلے کے کچھ نشانات ملے ہیں، اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی اجودھیا رام کا شہر تھا، اور یہیں ان کی جنم بھومی ہے تو رام کا ڈھائی ہزار سال پہلے کا زمانہ اجودھیا کے پتہ چلائے ہوئے آثار سے میل نہیں کھاتا۔

ڈاکٹر شکلا یہ بھی لکھتے ہیں کہ بودھ کے زمانہ میں اجودھیا میں جو حکومت قائم ہوئی اس کے نشانات کا تو پتہ چلتا ہے، مگر اس سے پہلے کی حکومت کے تہذیب اور آثار کا بالکل پتہ نہیں ہے: اس لیے جو لوگ اجودھیا میں کسی جگہ کو رام جنم بھومی مانتے ہیں، ان کی تائید نہ تو تاریخ اور نہ آثار قدیمہ سے ہوتی ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ رامائن کے اجودھیا اور موجودہ اجودھیا میں بڑا فرق ہے، رامائن

میں ہے کہ کوشل کا دارالسلطنت اجودھیا سرجو ندی کے کنارے پر ضرور تھا، مگر ندی سے کافی دور ساڑھے تیرہ میل پر تھا، مگر آج کا اجودھیا ندی سے بالکل قریب ہے، رامائن میں یہ بھی ہے کہ سرجو ندی مغرب کی جانب بہتی ہے، اور گنگا سے کچھ دور ہے، مگر آج کل یہ ندی پورب کی جانب بہتی ہے، اور یہ پراپتی میں نہ کر گنگا میں جا کر ملتی ہے، ڈاکٹر شکلا نے یہ بھی پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ راون اور رام کی لڑائی کا ثبوت بھی کتبے اور آثار قدیمہ سے نہیں ملتا، وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ رامائن میں ذکر ہے کہ شرنگویر پور میں گنگا پار کر کے رام بھاردواج آشرم گئے، مگر ان دونوں جگہوں کی کھدائی ہو گئی ہے، جس میں حضرت عیسیٰؑ سے سات سو سال پہلے کی انسانی آبادی کا پتہ نہیں چلتا۔

آخر میں ڈاکٹر شکلا لکھتے ہیں کہ رام جنم بھومی کو آزاد کرانے کا پروگرام خاص سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت شروع کیا گیا ہے، اس طرح نفرت پھیلا کر ان جگہوں کو جہاں مسجدیں موجود ہیں رام جنم بھومی اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی دعووں کے ذریعہ ان پر قبضہ کرنے کی مہم ہے۔

السٹریٹڈ ویکلی کا ایک مقالہ

السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا مورخہ ۲۱ ر ۱۵ / جون ۱۹۸۶ء میں چیدا نند داس گپتا کا ایک مضمون نکلا ہے، جس میں یہ بیان ہے کہ:

مورخین کا اس پر اتفاق نہیں کہ رام چندر جی کہاں پیدا ہوئے؟ اور وہ تو ان کی پیدائش کے پانچ سو برس تک کے حالات کا پتہ نہیں چلا سکتے، ان کو اس سے بھی پریشانی ہے کہ وید میں تو یہ ہے کہ دسرتھ اور رام وارانسی کے راجہ تھے، اس میں ان کو اکسواکو خاندان کا راجہ نہیں بتایا جاتا ہے، دسرتھ جاتکا میں بھی ان کو وارانسی کا راجہ بتایا گیا ہے، اس میں تو یہ بھی ہے کہ سیتا کا کوئی تعلق جنک سے نہ تھا، اگرچہ رامائن میں بودھ کا ذکر ہے، لیکن بودھ کے زمانہ میں کوشل کا دارالسلطنت اجودھیا نہ تھا، بلکہ سرَوستی تھا، اور پتانجلی کے زمانہ میں ساکیت تھا، پھر رامائن میں اجودھیا کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے اس سے تو ظاہر ہے کہ یہ چوتھی صدی قبل مسیح کا شہر نہیں ہو سکتا ہے۔

اور پھر ان ہی مضمون نگار کا یہ بھی بیان ہے کہ :

راماین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی بیوی کا وارث ہوجاتا تھا، اسی لیے سیتا لکشمن کو یہ طعنہ دیتی ہے کہ وہ اسی لیے رام چندر کے گم ہوجانے پر ان کو تلاش نہیں کرتے اور پھر سیتا رام چندر کو یہ بھی ملامت کرتی ہے کہ وہ سادھوؤں کے جنگل میں مسلح ہوکر آتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ رام یہاں اس لیے آئے تھے کہ مدھیہ پردیش کے ان غیر آریائی قبیلوں پر فتح پائیں جن کو راکشش کہا جاتا تھا، اس طرح یہ ظاہر ہے کہ راون نے سیتا کا اغوا کرکے اس حملہ کا بدلہ لیا، جو غیر آریائی علاقہ پر کیا گیا تھا، پھر بہت سے دانشوروں کا یہ خیال ہے کہ لنکا مدھیہ پردیش میں تھا، لنکا سے موجودہ سری لنکا مراد نہیں ہے،

آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے :

اگر رام ایک آئیڈیل فرزند، شوہر اور راجہ تھے، یا لکشمن اور بھرت آئیڈیل بھائی تھے، یا سیتا ایک آئیڈیل بیوی تھیں تو پھر اس پر زور دینے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوئے، اگر ان کا احترام اس لیے ہے کہ وہ آئیڈیل نمونے تھے تو بھگتی ...... کے لحاظ سے مورخین کی یہ ساری بحثیں بیکار ہیں، لیکن یہ سارے واقعات اس طرح سادہ نہیں ہیں! یہ بنیاد پرست کہتے ہیں کہ ہم رام اور سیتا کو آئیڈیل نمونے تسلیم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، ہمارے جنتوں نے ان کی جو پیدائش کی تاریخ اور پیدائش کی جو جگہ بتائی ہے، ان کو تاریخی حیثیت سے ہم کو تسلیم کرنا ہے، اور اسی کے سہارے دوسرے فرقے سے جنگ کرکے ان سے بازی جیت سکتے ہیں، یہ تسلیم کہ رام کی پیدائش کی جگہ کا ثبوت سائنٹفک طریقہ سے نہیں ملتا ہے، لیکن ہم کو اس کی پروا نہیں، بابری مسجد اور رام جنم استھان کے جھگڑے میں جو جذبات ابھرے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخ کی ساری کتابیں جلادی جائیں، برہمن اس کی پھر سے تاریخ لکھیں گے، اپنی اس

رزمیہ کہانی کو پھر سے سنائیں گے، پھر سے اس کی تعبیر کریں گے، اور اس میں طرح طرح کی ایجادات کا بھی اضافہ کریں گے، اور وہ اپنے پرانوں کو بھی پھر سے قلمبند کریں گے، اور اس کی پرواہ کریں گے کہ تاریخی حیثیت سے ان کا کیا مقام ہے۔

اس ڈیل کے بعد پھر سارے معاملات کا تاریخی، قانونی اور اخلاقی جائزہ اور تجزیہ کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔

تتمہ | مگر آخر میں یہ کہنا ہے کہ لکھنؤ کی ریاستی اور دہلی کی مرکزی حکومتیں ٹھنڈے طریقہ سے وطن دوستی اور وطن دشمنی، قومی یکجہتی اور قومی پراگندگی، جذباتی ہم آہنگی اور جذباتی بیزاری، روادارانہ نیشنلزم اور جارحانہ نیشنلزم، سیکولرزم اور ٹوٹالیٹیری ای نزم Totalitarianism محبت کی شمیم انگیزی اور نفرت کی شر انگیزی، انصاف اور جبر، خیر اندیشی اور بد اندیشی میں تفریق کریں، اور اپنے ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے جذبات اور احساسات کا لحاظ رکھتے ہوئے منصفانہ، مدبرانہ اور روادارانہ فیصلہ کریں، اور فیصلہ ان مطالبات پر مبنی ہونا چاہیے، جو پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلی کے منتخب مسلمان اراکین نے اپنے اپنے میمورنڈم میں پیش کیے ہیں، جن کی نقلیں گذشتہ اوراق پر پیش کی جا چکی ہیں۔